وَرَق وَرَق

ظ انصاری

پبلشرس
دانشورس اکاڈیمی - ۵۹ محمد علی روڈ - بمبئی ۳

پہلی اشاعت ۱۱۰۰

کل صفحے ۲۰۰
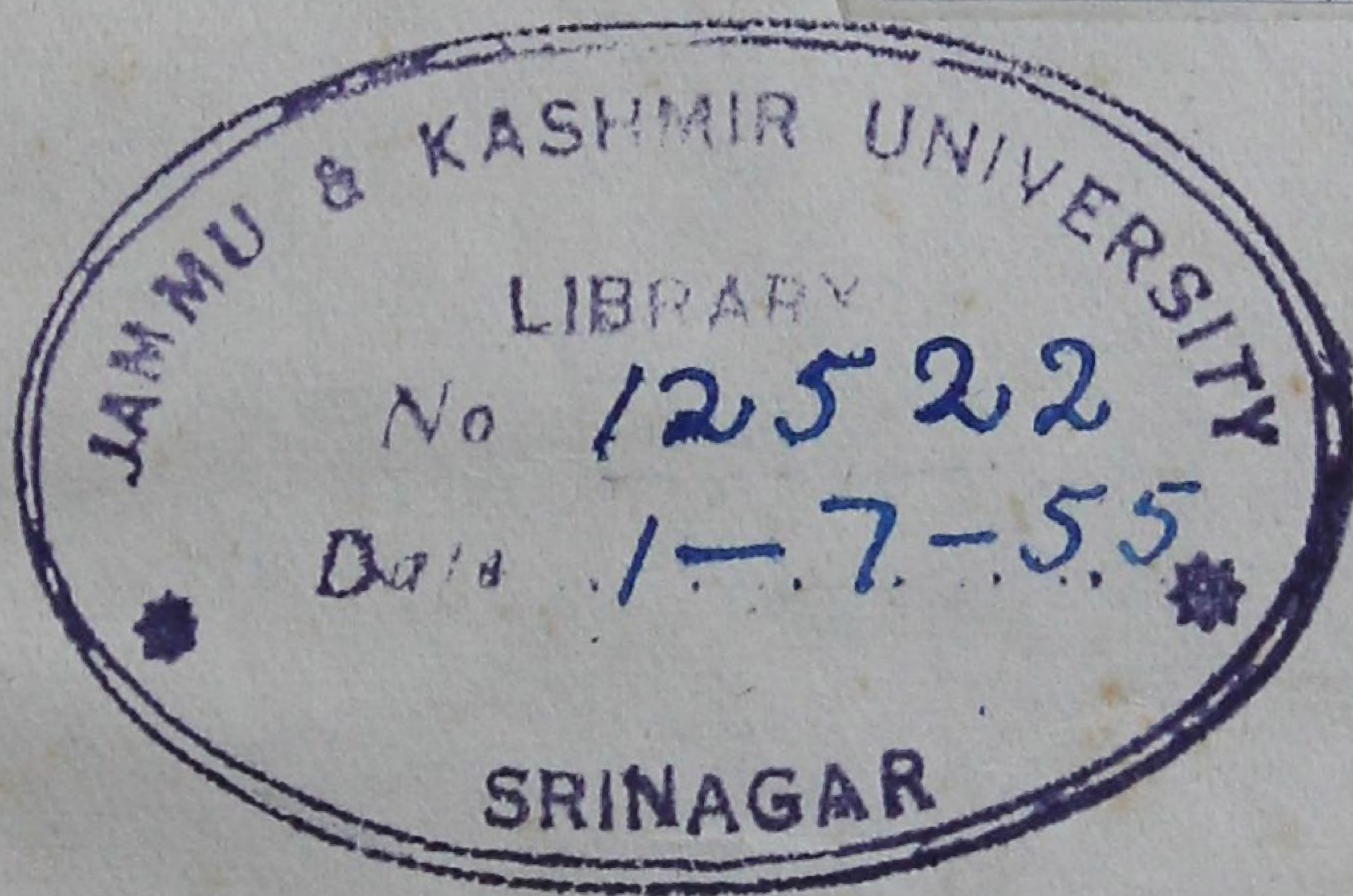
سرورق اور ٹائپ۔ اعجاز پرنٹنگ پریس۔ بمبئی ۳

لیتھو۔ یونائیٹڈ فائن آرٹ پریس۔ مجگاؤں۔ بمبئی

تین باب

اُن آوراق کے نام

جو اس کتاب کی تنگ دامانی میں سمانے سے رہ گئے
ان میں کوئی ستر ورق تو ایسے تھے
جنہیں فخر تھا کہ انکے بغیر «ورق ورق» کی محفل بے جان رهیگی
اب وہ حسرت سے ایک دوسرے کا منھہ تک رہے ھیں
بے روزگار نوجوانوں کی طرح۔
اور پوچھتے ھیں ——— «ھمارا کیا قصور تھا؟»
میں جواب دیتا ھوں «معاشی بحران اور اشاعتی سنکٹ»
یہ کتاب چھٹنی کی زد میں آئے ھوئے انھی اوراق کے نام
معنون کرتا ھوں۔

ورق ورق

باب اول

ـــ ہ ـــ

"...... مجھے میری ماں نے کچھ بھی تو نہیں دیا۔ میں زندگی بھر اُس کے پیار کے لئے ترستا رہا۔ اسی پیار کی تلاش میں میں جہاں بھی گیا اندھیرا ہی پایا۔ اب میری زندگی میں صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور اس اندھیرے کا دھواں ایک حسین سپنے کی یاد دلا رہا ہے جو میں نے کبھی دیکھا تھا .... !"

اچانک اپنی نئی کہانی کی آخری سطریں لکھتے لکھتے میرا قلم رُک گیا۔ مجھے ایک ہلکی سی، میٹھی سی آواز سُنائی دی۔

"آج سے میں آپ کے کمرے کا آتش دان جلایا کروں گا۔"

میں نے اپنی آنکھیں اُٹھالیں۔ دس بارہ سال کا ایک معصوم کا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا۔

"میں لکڑیاں بھی کاٹ کر لایا کروں گا۔" وہ تیزی سے بولا۔

"دیکھو، میں نے یتیم خانے سے کسی کو بلوایا ہے، مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔" میں نے روکھے انداز میں جواب دیا۔ اور پھر لکھنے میں مشغول ہو گئی۔

وہ چند لمحے اُسی انداز سے کھڑا مجھے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"میں یتیم خانے ہی سے آیا ہوں۔"

میں نے اُس کی طرف پہلی بار گھور کر دیکھا۔ موٹی موٹی گہری نیلی آنکھیں، چوٹا سا تھا، خوبصورت چہرہ، دُنیا بھر کی معصومیت لئے ہوئے چھوٹے چھوٹے خُشک بال —— !

"تم اتنے چھوٹے ہو لکڑیاں کیسے کاٹ سکو گے؟" میں نے اُس کے پتلے بازوؤں کو دیکھ کر کہا۔

"لکڑیاں کاٹنے کے لئے عُمر کی نہیں، تجربے کی ضرورت ہے۔ اور میں مُدت سے لکڑیاں کاٹتا آیا ہوں۔"

میں نے سر کے اشارے سے کمرے میں پڑے ہوئے کلہاڑے کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے کُلہاڑا ہاتھ میں اُٹھایا اور باہر چلا گیا۔

میں ایک کہانی کار ہوں۔ اپنی کہانیوں کی تلاش میں اپنے گھر سے سینکڑوں میل دُور اِس پہاڑی علاقے میں آئی تھی۔ سوچا تھا موسم خوشگوار ہوگا، دھُوپ ہوگی۔ نئی نئی اور خُوبصُورت کہانیاں لکھ سکوں گی۔ مگر میرے اللہ! یہاں کے موسم کا کیا بھروسہ! پچھلے چند دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ اِس قدر بڑھ گئی تھی کہ دن بھر آتش دان کو جلائے رکھنا پڑتا تھا۔ صحن میں گیلی لکڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا، صرف کاٹنے کی ضرورت تھی۔ اِسی کام کے لئے چودھری نے

مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاس والے یتیم خانے سے کسی آدمی کے لئے کہہ دیگا۔

لکڑیاں کاٹنے کی ہلکی ہلکی دھیمی آواز اب بھی میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد جب وہ اندر کمرے میں آیا تو میں حیران رہ گئی، اُس نے بہت ساری لکڑیاں کاٹ دی تھیں۔ میری آنکھوں کی حیرت کو نظر انداز کر کے وہ بولا۔

"آتش دان میں اس وقت لکڑیاں ہیں۔ اب میں شام کو آؤں گا۔"

میں نے ایک روپیہ کا نوٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تھوڑی دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھُل گئے، پھر بند ہو گئے۔ اُس کی زبان پہ کوئی بات آ کر رُک گئی۔ اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ تیزی سے مُڑ کر بھاگ گیا!

شام کو مجھے پھر لکڑیاں کاٹنے کی ہلکی ہلکی آواز سُنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ صحن کے ایک کونے میں کھڑا آہستہ آہستہ لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ میں اندر آ کر پھر اپنی کہانیوں میں کھو گئی۔

اچانک لکڑیاں کاٹنے کی آواز بند ہو گئی اور چند لمحے بعد وہ کمرے میں چلا آیا۔

"دیکھئے۔" وہ اندر آتے ہی بولا۔ "یہ روپیہ آپ واپس لے لیجئے۔"

میں حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی اور تیزی سے پُوچھا۔ "کیوں؟"

"یہ کلہاڑا مجھ سے ٹوٹ گیا ہے صبح اور اِس وقت کی مزدوری سے اِس کی مرمت ہو سکتی ہے۔"

وہ کھڑا میرے جواب کا منتظر رہا۔

"اس میں تمہارا کیا قصور ؟ تم تو لکڑیاں ٹھیک طرح سے کاٹ رہے تھے میں چودھری سے کہہ دوں گی کہ وہ اس کی مرمت کرا دے۔"

وہ وہیں اُسی انداز میں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں اب روپیہ کا نوٹ تھا۔

"بیٹھو" میں نے کہا۔

وُہ بیٹھ گیا۔ "کیا نام ہے تمہارا ؟"

"راجا"

"راجا—— اچھا خوبصورت نام ہے۔ کب سے ہو یتیم خانے میں ؟"

"چار سال کا تھا جب یہاں داخل کیا گیا تھا"

اور پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔ میں اپنی کہانی کے خدوخال سنوارتی رہی۔ کبھی کبھار جب میری نظریں اُس کی طرف اُٹھ جاتیں تو میں اُسے اپنی طرف دیکھتا ہُوا پاتی۔ اتنے میں میرا اُکتا کتا آ گیا اور وہ دونوں کھیلنے لگے۔ میرے خیال میں ایک بچے میں اور ایک کُتّے کی زندگی میں تنہائی کا ایک ہی جذبہ پایا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے چند ہی لمحوں میں وہ گہرے دوست بن گئے تھے !

میں کہانی لکھتی رہی اور وہ دونوں دیر تک کھیلتے رہے۔ کبھی کبھار وہ آتشدان میں لکڑیاں ڈالنے کے لئے اُٹھتا۔ جب رات اُتر آئی تو میں نے اُس سے کہا۔

"اب تمہیں واپس جانا چاہئے۔ کافی رات ہو گئی ہے۔"

وہ گھبرا سا گیا۔ میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

"کل کس وقت آؤں؟"

میں نے لکڑیوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "لکڑیاں کافی ہیں کل آنے کی ضرورت نہیں"

اچانک اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اُس کی پلکیں چند لمحوں کے لئے تھرتھرائیں۔ اور وہ آہستہ سے بولا۔

"اگر آپ کہہ دیں تو میں کل سویرے بھی آجاؤں۔ میں لکڑیاں کاٹوں گا۔ مزدوری نہیں لوں گا"

میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی التجا تھی۔

"مگر کیوں؟"

"میں یتیم خانے میں تنگ آجاتا ہوں" وہ آہستہ سے بولا۔ "وہ کسی کام کے بغیر باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے"

میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئی، پھر بولی۔

"اچھا — کل شام کو آنا۔ لکڑیاں کاٹنے کی ضرورت نہیں۔ تم ٹانی کے ساتھ کھیل لینا"

دُوسری صبح جب میں اپنے کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو میں نے دیکھا راجا اور ٹانی کھیل رہے ہیں۔

"ارے راجا! تم اتنی جلدی چلے آئے۔ کیا بات ہے؟"

"رات کو بارش ہوئی نا۔ میں نے سوچا لکڑیاں گیلی ہوگئی ہوں گی"

وہ اندر آیا اور آتش دان پر گیلی لکڑیاں خشک کرنے لگا۔ میں کافی پیتی رہی۔ اُس کے ہونٹ کبھی کھُلتے اور کبھی بند ہوتے۔ ہر بار وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، ہر بار کچھ سوچ کر رُک جاتا تھا۔ آخر میں ہی پوچھ بیٹھی ۔

"کیا بات ہے راجا، تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

وُہ خاموش ہو گیا۔ پھر ایک دم بولا — "میری ماں بالکل آپ جیسی ہے"۔

میں حیران رہ گئی ۔ تو یہ بات تھی جو کہنے کے لئے راجا کشمکش میں پڑ گیا تھا۔

"مگر راجا تم اپنی ماں کو کیسے جانتے ہو، تم تو صرف چار سال کے تھے جب یتیم خانے میں آئے تھے"۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میری ماں اب بھی زندہ ہے"۔

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے سر پر ہتھوڑے مار رہا ہو۔ میرا سر پھٹنے لگا۔ وہ کیسی ماں ہے جس نے اتنے خوبصورت بچّے کو اپنی آنکھوں سے جُدا کر دیا۔ میرے اللہ چار سال کی عمر میں اِس کی آنکھیں تو اتنی ہی خوبصورت رہی ہوں گی۔ اِس کا چہرہ ایسا ہی معصوم رہا ہوگا۔ اِس کے بال ایسے ہی سُنہرے رہے ہوں گے۔ میں جانتی تھی کہ اِس یتیم خانے میں راجا کو ہر چیز ملتی ہے۔ کھانے کے لئے روٹی۔ رہنے کے لئے جگہ، پہننے کے لئے کپڑے — مگر ماں اور اُس کا پیار — وہ اُسے کہاں ملے گا، کون دے گا۔ یہ پیار اُس کے لئے اب اندھے خواب کی طرح تھا جو وہ ہر رات دیکھتا اور جسے وہ ہر صبح کھوتا۔ اُس کی ماں زندہ ہو کر دُور ہے وہ ماں نہیں !

میرے دل میں ہزاروں سوالات اُبھر رہے تھے مگر یہ سوچ کر کہیں راجا کا

درد جاگ نہ جانے میں خاموش رہی۔ مگر میں یہ خاموشی بھی برداشت نہ کر سکی۔
آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"تم اُس سے ملتے ہو؟"

"ہاں ہر گرمی کے موسم میں چند دنوں کے لئے۔"

میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ میں نے چاہا راجا سے پُوچھ ہی لُوں کہ تم اُس کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"صُورت تو بالکل آپ جیسی ہے۔" اُس نے کہا۔

میں گھبرا سی گئی۔ میرے سوال کا مطلب کچھ اور ہی تھا مگر خُود ہی بول اُٹھا۔

"وہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ یہ بنیاں اور کوٹ اُسی نے بھجوائے تھے۔ اب تو اُس کا خط بھی نہیں آیا۔ نہ جانے کیا بات ہے؟"

میں اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ ماں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی تھی۔

"آپ جو مزدوری مجھے دیں گی نا۔ اُس سے میں ماں کے لئے کپڑا خریدونگا۔"

"ہاں۔ ہاں ضرور ——" میں نے کہا۔

"میری ماں کا قد بالکل آپ اتنا ہے۔" راجا نے کہا۔

راجا دیر تک باتیں کرتا رہا۔ میں دیر تک اُلجھتی رہی۔ اُسے میں نے تھوڑے سے پیسے دے کر رُخصت کیا۔ اُس رات میں کافی دیر تک جاگتی رہی۔ رات کو میری طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور

پھر میری کہانیاں بھی تو مجھے مل گئی تھیں۔ اس جگہ ٹھہرنے کا اب کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔

میں نے سویرے ہی چودھری سے کہا اور اپنے جانے کا پیغام راجا کو بھجوا دیا۔ بارہ بجے تک میں راجا کا انتظار کرتی رہی مگر وہ نظر نہیں آیا۔ چودھری پھر یتیم خانے گیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ راجا کہیں چلا گیا ہے۔ مجبور ہو کر میں نے چودھری کے پاس راجا کے لئے کچھ پیسے رکھ دیئے۔

میں جلدی سے تیار ہو کر کار کی طرف جانے لگی۔ کار میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرنے ہی والی تھی کہ ایک خاص چیز پر میری نظریں اٹک گئیں۔

کار میں کپڑا پڑا ہوا تھا — میں نے کپڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا، اور پھر چودھری کو بلا کر پوچھا۔

"ارے بھئی یہ کیا ہے؟"

وہ کپڑا دیکھ کر حیران ہو گیا اور پھر بولا۔ "یہ کپڑا تو کل راجا خرید رہا تھا۔ آپ کی کار میں کیسے آیا؟"

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں —" میں نے کہا۔ "یہ تو راجا نے اپنی ماں کے لئے خریدا ہو گا۔"

"ماں"! چودھری چیخا —— "کون ماں —— کس کی ماں — راجا کی کوئی ماں نہیں — اس کی ماں تو میرے سامنے مر گئی تھی جب وہ صرف چار سال کا بچہ تھا" !!!

• •

"بابُو جی، آپ ایک نظر بُلبل کو دیکھ تو لیجئے۔"

میں خاموشی سے آگے چل دیا جیسے میں نے اس کی بات ہی نہ سُنی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی بے بسی چھاگئی۔ عجیب سی لاتعلقی، عجیب سی یاسیت۔ لیکن اُس نے ہمّت نہیں ہاری۔ وہ تیزی سے میرے قریب آگیا۔

"بابُو جی وُہ خوبصورت ہے آپ اُسے دیکھ تو لیں۔ میری بُلبل آپ کو ضرور پسند آئے گی۔"

اب کی بار اُس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی۔ میں نے اُسے مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وُہ خود ہی بول اُٹھا۔

"اگر دن بھر بُلبل آپ کے ساتھ رہے گی تو کرایہ نسبتاً کم ہوگا۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ چلو دکھاؤ کہاں ہے تمہاری بُلبل۔"

وہ خوش ہوا۔ اُس کے مُردہ چہرے پر چمک آگئی۔ چپٹی ناک، خارش زدہ ہاتھ، پھٹے پُرانے اور میلے کپڑے اُس کی غم زدہ زندگی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ میں اُس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دُور چل کر اُس نے مجھ سے کہا۔

"بابُوجی دیکھ لیجئے بُلبل کو کتنا سفید ہے رنگ اِس کا۔"

میں نے بُلبل کی طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حرکت ہوئی۔ اس کے کان پھڑپھڑائے اور وہ زور سے ہنہنا دی۔

اُس نے کہا۔ "بابُوجی! بُلبل جیسی گھوڑی سارے گلمرگ میں ایک ہی ہے۔ اتنی تیز رفتار گھوڑی گلمرگ میں کیا سارے کشمیر میں نہیں مل سکتی۔"

وہ بولتا رہا۔ میں سُنتا رہا۔ اور گھبراتا رہا۔ ایک معمولی ادیب قلم کو چلانا جانتا ہوں۔ بُلبل جیسی تیز رفتار گھوڑی پہ بیٹھنا میرے لئے ایک مُشکل ترین لمحہ تھا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر میں نے گھوڑے والے سے کہا۔

"بھائی گھوڑے والے۔ تمہاری یہ تیز رفتار گھوڑی تم ہی کو مبارک ہو۔ میں پہلی بار گھوڑے کی سواری کر رہا ہوں۔ کہیں دُور نیچے گرا دیا تو ــــ؟ ناسمجھئے نا، مجھے تمہاری بُلبل نہیں چاہئے۔"

اُس کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ مگر تیزی سے بولا۔

"بابُوجی بُرا نہ مانئے گا، ایک بات بتا دوں؟"

"کیا ــــ؟" میں نے چونک کر پُوچھا۔

"سچ پُوچھئے تو یہ گھوڑی بڑی سُست رفتار ہے۔"

"پھر ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"بابُوجی کیا کریں جھُوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔"

میں حیران ہو گیا۔ اپنے بیوی بچّوں کو روٹی کا رُوکھا سُوکھا ٹکڑا کھلانے کے لئے اپنا پیٹ پالنے کے لئے اُنہیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ جھُوٹ بولنا پڑتا ہے۔ گھوڑے والا مجھے دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا میں ابھی وہاں سے بھاگ کر کسی دُوسرے گھوڑے والے کے پاس جاؤں گا۔

"بابُوجی ــــ" اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر نے لگے "ستمبر کا یہ مہینہ ہمارے لئے مصیبت کا مہینہ ہے۔ ہمارے یہاں سیلاب نہ آتا تو سارے سیّاح چلے نہ جاتے۔ اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ گلمرگ دیکھنے اب آتا ہی کون ہے۔ اس پر یہاں سینکڑوں گھوڑے والے ہیں۔ ان کے ہزاروں بیوی بچّے۔ کیا کریں بابُوجی"۔

میں خاموشی سے بُلبل کی گردن کے ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اور اِس پر سوار ہونے کی کشمکش ہی میں تھا کہ میرے قریب ایک کار آ کر رُک گئی اور اس میں سے راج اُترا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ــ

"ارے تم کب پہنچے؟"

"بس ابھی آیا۔ تمہارا ہی منتظر تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"آؤ چلیں۔" اُس نے کہا۔

راج نے بُلبل کی لگام کو پکڑ لیا اور کچھ کہے بغیر اِس پر سوار ہو گیا۔ میں نے گھوڑے والے کی طرف دیکھا۔ اس کی یاسیت بھری نگاہوں میں مجھے مسرّت کے فانوس پھُوٹتے نظر آئے۔ اس نے بید کی ایک نرم و نازک چھڑی سے گھوڑی کو مارا اور وہ آہستہ آہستہ اپنے راستے پر چل پڑی۔ میں نے ایک نیم مُردہ گھوڑے کا انتخاب

کیا اور اس پر سوار ہو کر راج کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تمہارا کیا نام ہے ؟" تھوڑی دُور چل کر میں نے اسے پُوچھا۔

"علیا — بابُو، علیا —"!

وہ ہمارے پیچھے پیچھے تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ گرتا پھسلتا، جیسے وہ بھی ایک گھوڑا ہو۔ میں نے گھوڑے کو چابُک مارا۔ وہ ذرا تیزی سے دوڑنے لگا۔ علیا کی رفتار میں بھی تیزی اور پھُرتی آ گئی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ میں نے گھوڑے کو ایک جگہ پر کھڑا کیا۔ راج مجھ سے آگے نکل گیا۔

"ٹھہرو — علیا —" میں نے کہا۔

وہ رُک گیا اور اپنا سانس سنبھالنے لگا۔

"علیا تم تیزی سے مت دوڑو۔ لو میں بھی آہستہ چلتا ہوں۔ صاحب کو جانے دو۔"

وہ مجھے گھُور گھُور کر دیکھنے لگا۔ شاید سمجھا ہو گا میں بھی کوئی بیوقوف سیّاح ہوں جو اس کے دُکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

"بابو جی —" علیا بولا۔ "آپ جیسے سبھی تو نہیں ہوتے۔ گھوڑوں کے ساتھ اُن کی رفتار سے دوڑنا تو ہماری زندگی بن چُکی ہے۔ اسی رفتار پر ہمارے پیٹ کا دار و مدار ہے۔"

مجھے ایسے لگا جیسے یہ اُس کی زندگی کا نشیب و فراز ہو جسے پار کر کے اُس کی کشتیٔ حیات کنارے لگ سکتی ہے۔ شاید اس کی منزل ہو جہاں پہنچ کر وہ اپنے شیریں خوابوں کی تعبیر دیکھ سکتا۔

بُلبل اب آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔

دفعتاً علیا کی آواز سُنائی دی —— "بابُوجی"۔

"کیا ہے"؟

"بابُوجی آپ کو قسمت دیکھنی آتی ہے"؟ اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں حیران ہو گیا۔ نہ جانے علیا کو قسمت کے اِس ہیر پھیر میں کس نے اُلجھا دیا تھا پہلی ہی نظر میں آدمی علیا کی قسمت کیا۔ اس کے آنے والے بچّوں پوتوں کا حال بتا سکتا ہے۔ مُصیبت۔ مُصیبت۔ اُس کی ہر رگ میں، جسم کے ہر انگ، ہر حصّے پر خون کے ہر قطرے میں مُصیبت، طوفان، غم اور نا اُمیدی چسپاں ہے۔ اور یہی غم یہی مصیبت اس کی زندگی ہے۔ اس غم اور مُصیبت کو سہتے سہتے اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

"ہاں علیا! میں نے تمہارے ماتھے کی لکیروں کو پڑھ لیا ہے۔ تم دُوسرے جنم میں امیر بن جاؤ گے"۔

"بابُوجی یہ جنم کیا ہوتا ہے"؟ اُس نے بڑی معصومیت سے پُوچھا۔

"جنم —— مرنے کے بعد آدمی دوبارہ زندہ ہوتا ہے نا اُسے جنم کہتے ہیں"۔

"مگر بابُوجی ہم جنم ونم نہیں مانتے ہیں"۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "علیا تمہارے دُوسرے جنم میں آنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم مر کر پھر سے زندہ ہو جاؤ گے۔ گندگی کے اِس لبادے کو پھینک کر سادہ اور صاف لبادہ پہننے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا ملے۔ تمہاری بیوی بچوں کو بھُوکا نہ رہنا پڑے۔ انسان ہو کر حیوان کی طرح نہ دوڑنا پڑے تو وہی تمہارا دُوسرا جنم ہوگا —— سمجھے!

"بابُوجی ــــ" اُس نے کہا۔ "پچھلے سال ایک اور بابُوجی نے ایسی ہی باتیں کی تھیں۔"

"کیا کہا تھا اُس نے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اُس نے میرے بیٹے سے کہا تھا کہ چند ہی روز میں وہ چھ سات گھوڑوں کا مالک بن جائے گا۔ وہ بہت امیر بن جائے گا۔ میرا بیٹا اِس قدر خوش ہُوا تھا کہ اُس نے بابُوجی سے کرایہ بھی نہ لیا۔"

"اچھا۔"

"ہاں بابُوجی۔"

"پھر کیا ہُوا۔ کیا وہ امیر بن گیا؟"

"بابُوجی، اُس واقعے کے چند دن بعد جب میرا بیٹا گلمرگ سے ٹنگمرگ سواری کی تلاش میں آ رہا تھا کہ گھوڑے سمیت کھڈ میں گر کر مر گیا۔"

میں چونک پڑا۔ علیا مُسکرا رہا تھا جیسے اس کا بیٹا نہیں مرا ہو بلکہ ایک کھلونا گر کر ٹُوٹ گیا ہو۔ لیکن مجھے علیا کی اس مُسکراہٹ میں ایک بھرپُور طنز کی جھلک دکھائی دی اور مجھے لگا جیسے وہ اپنی بربادی پر مُسکرا رہا ہو۔

"بابوجی۔" اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بابُوجی ہماری زندگی کیا ہے۔ اِس سڑک پر یہ بکھرے ہوئے پتھر دیکھ رہے ہیں آپ ـــــ بے جان، بے حس اور خاموش پتھر۔ بس ہم بھی یہی پتھر ہیں۔ جو بھی یہاں سے گزرتا ہے ان پتھروں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ ہماری زندگی کو روندتا چلا جاتا ہے۔ کوئی نہیں سمجھتا کہ ان پتھروں میں بھی جان ہے۔ ان کا بھی دل ہے۔ یہ بھی جینا چاہتے

ہیں۔ بابُوجی وہ زمانہ کب آئے گا جب یہ پیتھر بھی چیخ سکیں گے۔ روندتے ہوئے پیروں کو اپنے سے دُور رکھ سکیں گے۔ ہم جانتے ہیں وہ زمانہ کبھی نہیں آئے گا، کبھی نہیں آئے گا، کبھی نہیں۔ صدیوں کا دستور تھوڑے ہی بدل سکتا ہے "۔

اور میں علیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس کی خُوشی، اُس کا دُکھ، اپنی حالت جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو میرا دماغ جھُنجھلا گیا۔ اس جھنجھلاہٹ سے بچنے کے لئے میں نے علیا سے پُوچھا۔

"کیا بُلبل تمہاری ہے؟"

"نہیں تو بابُوجی۔ میری گھوڑی میرے بیٹے کے ساتھ کھڈ میں گر کر مر گئی نا۔"

"اوہ" یہ سُن کر مجھے بڑا دُکھ ہُوا۔

"لیکن یہ گھوڑی کس کی ہے؟"

"نمبردار کی ہے۔ میری بیوی بیمار ہے، بہت بیمار۔ دوا کے لئے کوئی پیسہ نہیں۔ کہتے ہیں اُسے تپدق ہے۔ اُسے دوا چاہیئے۔ خوراک چاہیئے۔ میں غریب ہوں۔ بابُوجی دوا کہاں سے لاؤں، غذا کہاں سے لاؤں۔ جوان بیٹا تھا۔ اپنا گھوڑا تھا۔ دونوں مر گئے۔ اور اب نمبردار سے اُس کی گھوڑی لی ہے۔ یہی بُلبل بابُوجی۔ نمبردار کو روز کے دو روپے دینے ہیں۔ چاہے کچھ کماؤں یا نہ کماؤں۔ کوئی خریدار ملے یا نہ ملے"۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اور پھر خُود ہی بولنے لگا۔

"اُجرت دینی ہے بابُوجی، کرایہ دینا ہے۔ بابُوجی میری بیوی بچ جائے گی نا؟"

"ہاں علیا تمہاری بیوی بچ جائے گی۔ ضرور بچ جائے گی"۔

وہ خاموش ہو گیا اور میں سوچنے لگا۔ آخر کب تک مجھے نادروں کی

چھاؤں میں یہ لوگ ٹھنڈی کونپلوں کے خواب دیکھتے رہیں گے۔ آخر کب تک یہ لوگ جھوٹی مسکراہٹوں سے دُنیا کا ساتھ دیتے رہیں گے۔ کب تک ان کی آنکھوں میں اُداسی تیرتی رہے گی۔ کب تک ؟ خُدا جانے کب تک ان کی زندگی بھی زندگی بن جائے گی۔ خوشحال اور شاداب زندگی۔ پھولوں، گیتوں اور نغموں سے بھرپور زندگی جہاں بھوک نہ ہو، فاقے نہ ہوں، ننگا نہ رہنا پڑے۔ جہاں پیٹ بھر کر کھانا ملے۔

"بابُوجی" میرے خیالات کا تسلط ٹوٹ گیا۔

"کیا ہے ؟" میں نے پُوچھا۔

"میرا اداالصحب مجھے بخشش دے گا۔ بخشش بابُوجی تاکہ میں دوائی خرید سکوں"۔

"ہاں ہاں ضرور دے گا۔ وہ بڑا آدمی ہے" علیا کے مُردہ ہونٹوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اتنے میں ہم گلمرگ پہنچ گئے۔ راج میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے گھوڑے والوں سے کہا کہ وہ واپسی پر ہمارا انتظار کریں۔ گلمرگ کے موسم کا کبھی کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی تپتی ہوئی دُھوپ ہے اور ابھی موسلا دھار بارش۔ اس لئے جب گلمرگ میں ہمارے پہنچتے پہنچتے بارش شروع ہو گئی تو میں حیران نہیں ہوا۔ ہم جلدی سے ٹورسٹ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ میں باہر برآمدے میں ہی بیٹھ گیا اور دُور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ گلمرگ کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ علیا اور اُس کی کہانی نہ جانے میرے ذہن کے کس تاریک کونے میں گم ہو گئے۔ میں وہ جگہ بھول گیا جہاں علیا رہتا ہے۔ اس کی بیمار بیوی رہتی ہے۔ جہاں دوائی نہیں ملتی۔ جہاں زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ جہاں صرف ویران اور سیاہ راتیں حکمران رہتی ہیں۔ جہاں کبھی سویرا نہیں آتا۔

جہاں ـــــ ؟

گلمرگ کتنی خوبصورت جگہ ہے ۔

" ارے بھئی عرفان ــــ !" مجھے راج کی آواز سنائی دی ۔

میں مسکرا دیا ۔ اور اس کی طرف بھاگ گیا ۔ وہ اندر ایک اور آدمی کے ساتھ مے نوشی میں مشغول تھا ۔ وہ دونوں گھوڑے والوں کی موجودہ حالت میں الجھ گئے تھے ۔ راج کہہ رہا تھا ۔" یار ان کی حالت جتنی نازک ہے اس سے زیادہ نازک تو اپنی حالت ہے ۔ ادھر بوڑھا باپ سانپ بن کر دولت پر جھپٹ کر بیٹھا ہے ۔ ادھر میں کنگال ہو رہا ہوں ۔ ستر سال عمر ہے اور بیوی رکھی ہے بیس سال کی ۔ حد ہوگئی شرافت کی ۔ اب اس گھر میں میری کیا گزر ہو گی جہاں ماں کی عمر بیس سال ہو . . . . . . !"

" یہ تو ٹھیک ہے " نوجوان بولا ـــــ " گھوڑے والوں کی حالت پتلی ہے تو ہونے دو ۔ اگر جوانی میں ہم نے ان چیزوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تو تپ دق ہو جائے گی ۔ اور میرا بھائی اس مرض کا ڈاکٹر ہے ۔ مگر اس کے پاس اس مرض کا واحد نسخہ ہے جو مجھ پر آزمایا نہیں جا سکتا ۔"

" کون سا نسخہ بھئی " راج نے ایک اور پیگ انڈیلتے ہوئے کہا ۔

" موت کا ! "

ہم سب بے ساختہ ہنس پڑے ۔

اور میں سوچنے لگا ۔ یہ گھوڑے والوں کی اقتصادی حالت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں یا اپنے والدین کے متعلق ! میرے ذہن میں علیا اور بلبل کی کہانی پھر

اُبھرنے لگی ۔ یہ لوگ شراب پی رہے ہیں اور علیا کی ۔ بیوی دوائی کے لئے ترس رہی ہے ۔ راج کے مُنہ سے شہابی رنگت کی مے چھلکتے دیکھ کر میرے سامنے علیا کی خون تھوکتی مدقوق بیوی کی تصویر ناچنے لگی ۔

میں گھبرا سا گیا اور وہاں سے بھاگ کر باہر چلا آیا ۔

"کہاں جا رہے ہو؟" نوجوان نے پوچھا ۔

"باہر جا رہا ہوں ۔ بارش میں بھیگنے سے مزہ آتا ہے ۔"

وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا جیسے میں والٹ ڈزنی کا کوئی کارٹون ہوں ۔ میں بالکل اسی انداز میں مُسکرا دیا ۔ اور باہر چلا آیا ۔ تھوڑی دیر بعد راج بھی چلا آیا ۔ ہم گلمرگ کی گاف لنکس میں دوڑتے رہے، پھسلتے رہے ۔ راج کہہ رہا تھا ۔ "عرفان سوچ رہا ہوں پتاجی کے مرنے کے بعد میں کیا کروں گا ۔۔۔!"

میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا ۔ یہ لڑکا کس مزے سے اپنے باپ کی موت کا تذکرہ کر رہا ہے اور اُس گھوڑے والے نے کس انداز میں اپنے بیٹے کی موت کا تذکرہ کیا تھا ۔ راج کے انداز میں ایک شان ہے ایک ہونے والی کامیابی کی خوشی، گھوڑے والے کے انداز میں ایک شکایت تھی ۔ مستقبل برباد ہونے کی ایک کراہ تھی ۔ ایک تڑپ تھی، ایک طنز تھا !

"راج کبھی سوچ سمجھ کر بھی باتیں کیا کرو ۔"

"اس میں سوچ کی کون سی بات ہے ۔ وہ ہزاروں روپے اپنی جوان بیوی پہ لُٹا رہا ہے اور وہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"راج ۔۔۔" میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے ۔

"میرے خوبصورت افسانہ نگار، سچائی سچائی ہے۔ تم بزدل ہو کہ اصلی بات کہنے سے ڈرتے ہو۔"

"کیوں ——!"

"اِس لئے کہ میرے سامنے میرے ہمدرد بنتے پھرتے ہو اور میرے بعد بڑی شان سے میری ماں کی باتیں کرتے ہو۔ ڈیئر تم سب بزدل ہو۔ یہاں آکر گھوڑے والوں سے اُن کی درد بھری داستان سُن کر اُن کی مصیبتوں پہ پسیجتے ہو گے اور پھر چند لمحے بعد اُنہیں بھُول جاؤ گے۔ کیونکہ وُہ بھُولنے والی چیز ہے۔"

وہ مُسکرایا اور میں اپنا کردار ٹٹولنے لگا۔ راج نے جو کچھ کہا وہ حقیقت پہ مبنی تھا۔ مجھے محسوس ہُوا راج عظیم ہے۔ وہ پھر کہنے لگا۔ "تم ادیب ہو ہمیشہ لوگوں کے درد اور خوشی اور دُوسری چیزوں کا جائزہ لیتے ہو۔ کبھی اپنے اندر کے کردار کو بھی ٹٹولا ہے۔ ابھی گھر جا کر ان گھوڑے والوں پہ ایک کہانی لکھو گے یہ تمہارے اندر کا ادیب ہے جو تمہیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ کبھی اپنے اندر کے انسان کو دیکھو۔ اپنی کمزوریوں کو ٹٹولو۔ تم بذاتِ خود ایک کہانی ہو ——!"

"مگر آج تم یہ سب کیوں کہہ رہے ہو؟"

"اِس لئے کہ ہوٹل سے تم اس طرح بھاگ گئے تھے جیسے ہم اِس دُنیا کی باتیں نہیں کر رہے تھے۔"

راج بولتا رہا اور میں سُنتا رہا ——!

راج عظیم ہے۔!!

رات کو جب راج کی کار میں سری نگر آ رہے تھے تو وہ ہنس کر کہہ رہا تھا
"یہ سالے گھوڑے والے بڑے چالاک بنتے ہیں"۔
"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔
"ارے ہونا کیا۔ اپنے پاس ایک کھوٹا روپیہ تھا وہ گھوڑے والے
کو دیا ۔۔۔۔۔ !"
میرا دماغ تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میری نگاہوں کے سامنے علیا
کی صورت پھر گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے کہہ رہا ہو۔
"بابو جی، میری بیوی بیمار ہے، بہت بیمار ہے ۔۔۔۔۔ دوائی کے
لیے کوئی پیسہ نہیں، کہتے ہیں اُسے تپدق ہے ۔۔۔۔۔ اسے دوا چاہیئے۔
۔۔۔۔ خوراک چاہیئے ۔۔۔۔۔ میں غریب ہوں ۔۔۔۔ بابو جی ۔۔۔ بابو جی
صحب بخشش دے گا نا ۔۔۔ بخشش صحب ۔ تاکہ میں دوائی خرید سکوں ۔۔۔
بابو جی !!!"

"اگر تمہیں راستے میں راجو ملے تو؟"

"یا وہ مر جائے گا یا میں ___ سُنتی ہو کانتی" یہ کہہ کر بِنّا تیزی سے مُڑا اور گھوڑے کی پیٹھ پر زین رکھنے لگا۔ کانتی نے اپنے بڑے بھائی بِنّا کی طرف دیکھا۔ اِس کی آنکھوں میں بے انتہا نفرت تھی۔ انتقام کی ایک تیز آگ چمک رہی تھی۔ کانتی ان آنکھوں کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی نفرت کا اچھی طرح اندازہ کر سکتی تھی انتقام کی اِس آگ سے بھی وہ بے خبر نہ تھی۔ یہ نفرت اور یہ آگ، ہر اُس آدمی کے لئے بِنّا کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتی جو اس کی راہ میں آ کر اس سے ٹکرانے کی کوشش کرتا۔ نفرت اور انتقام کا یہ جذبہ تو بِنّا کے جسم کے انگ انگ میں لسا ہوا تھا۔ جب سے کانتی نے ہوش سنبھالا تھا جب سے اس کے سوچنے سمجھنے کا شعور پُختہ ہو گیا تھا۔ وہ یہ سب کچھ جان گئی تھی، پہچان گئی تھی۔

دفعتاً پنّا مڑا اور کہا —"تین دن کے لئے میں نے لکڑیاں کاٹ کر رکھی ہیں - راستہ خراب اور خطرناک ہے - میرے خیال میں ڈاکٹر تین دن سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا - تم سُدھیر کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا - دیکھو کہیں آگ ٹھنڈی نہ پڑ جائے - یہ سُدھیر کے لئے ضروری ہے - اس کی زندگی کا آخری سہارا ہے - اگر یہ سہارا ختم ہو گیا تو سُدھیر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا -"

کانتی نے خیمے کے اندر جھانکا - وہاں سُدھیر بے حس پڑا تھا - اس کی آنکھیں بند تھیں - چہرہ پیلا پڑ گیا تھا - سانس رُک گئی تھی - وہ موت اور زندگی کے نازک سنگم پر کھڑا موت سے لڑ رہا تھا - اُس کی حالت بہت نازک تھی - گولی لگنے سے خون اب بھی اُس کے کندھے سے بہہ رہا تھا - پنّا گھوڑے پر سوار ہو گیا -

"دیوتا محافظ" وہ تیزی سے گھوڑے کو لے بھاگا -

کانتی کی آنکھوں میں اچانک آنسو آ گئے - وہ بہادر لڑکی تھی مگر جنگل کی خوفناک تنہائی میں ، ایک چھوٹے سے خیمے میں موت سے لڑتے ہوئے آدمی کے ساتھ تین دن اور تین راتیں کیسے گذاری جا سکتی ہیں —؟ اُس نے اب تک نہ جانے ایسی کتنی راتیں گذاری تھیں — مگر یہ دن اور یہ راتیں — اُف — یہ سوچ کر وہ گھبرا گئی -

بھگوان نہ کرے اگر سُدھیر کو کچھ ہو گیا تو ؟

اگر راستے میں پنّا کو راجو مل گیا تو ؟

وہ جلدی سے اندر چلی آئی اور سُدھیر کے سرہانے کھڑی ہو گئی - وہ اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی - زرد پیلا چہرہ جس میں خون کی ایک بوند بھی نہ تھی - اُس نے

کمبل سے اُس کے جسم کو لپیٹ لیا۔ اور خود آگ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آگ کی گرمی دھیمی پڑ گئی تھی۔ اُس نے تھوڑی سی لکڑیاں اُٹھا کر اس میں ڈال دیں۔ آگ یکدم چمک اُٹھی ـــــ اُس کے ذہن میں صرف سُدھیر کا خیال تھا۔ کب پنّا آئے گا۔ کب ڈاکٹر آئے گا۔ اِس نے لاکھ بار پنّا اور سُدھیر کو سمجھایا تھا کہ وہ اپنے ڈاکہ ڈالنے کے خاندانی پیشے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ وہ اُسے ایک ننھّی سی بچّی سمجھ کر اس کے گالوں پر ہلکی سی چپت مار کر کہتے ـــ "کانتی تم ان جھمیلوں میں نہ پڑا کرو" اور وہ ہنستے ہنستے غائب ہو جاتے۔ اُن کا گھر کبھی چمبل کی گہری وادیوں میں ہوتا۔ کبھی آگرہ میں کبھی دہلی میں تو کبھی پنجاب میں۔ ہر بار وہ پولیس سے پیچھا چھڑا لیتے۔ ہر بار ایک نیا ڈاکہ پڑ جاتا ـــ اور ایک دن اچانک پنّا اور سُدھیر راجو سے ٹکرا گئے۔ شاید دونوں نے ایک ہی جگہ ڈاکہ ڈالنے کی سوچی تھی۔ راجو اور پنّا کا ٹکراؤ ڈاکو کیمپ میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر بار کسی نہ کسی گروپ کے چند آدمی ضرور مر جاتے۔ لیکن اب کی بار تو راجو اور پنّا کا ٹکراؤ اپنی نوعیت کا پہلا ٹکراؤ تھا۔ دونوں ایک ہی صف کے ڈاکو تھے۔ پنّا نے زندگی میں کبھی شکست قبول نہ کی تھی۔ مگر اُس روز اُسے راجو کے ہاتھوں شکست قبول کر لی ہی پڑی۔ کیونکہ پنّا کا بھائی سُدھیر راجو کی گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ پنّا نے چاہا تھا کہ وہ راجو کا تعاقب کر کے اپنے بھائی کا بدلہ لے مگر سُدھیر کی جان بچانے کی خاطر وہ اپنی چاہت کی تکمیل نہ کر سکا۔ جب کانتی نے اپنے بھائی کو اِس حالت میں دیکھا تو وہ رو اُٹھی ـــــ کاش وہ راجو کو جانتی، کاش راجو اُسے مل جاتا۔ وہ خود سُدھیر کا بدلہ لیتی۔ خود اُس کے سینے میں گولی داغ دیتی۔ کاش . . . . . . !

کانتی نے ایک لمبی سرد ٹھنڈی سانس لی اور باہر آ کر آسمان کی طرف دیکھا۔

بادلوں نے آسمان کو گھیر رکھا تھا۔ اُس نے لمبی تاریک پگڈنڈی کی طرف دیکھا جس پر
اُس کے بھائی کے گھوڑے کے ٹاپوں کے نشان تھے ـــــ اُس کا بھائی اپنے پیچھے
گرد اُٹھاتا ہوا چلا گیا تھا! یہ نشان وُہ مُدت سے دیکھتی آئی تھی۔ ان نشانوں کو
دیکھتے دیکھتے اُس نے اپنا بچپن گذارا تھا۔ اپنی جوانی گذاری تھی۔ اور اب ڈھلتی جوانی
میں یہ نشان اُس کی زندگی کے اتنے قریب تھے جیسے اُس کے اپنے دل کی دھڑکنیں
کانتی کو ان نشانوں سے نفرت تھی۔ بے حد نفرت۔ اُسے اپنی زندگی سے
نفرت تھی۔ اپنے ماحول سے نفرت تھی۔ اور کبھی کبھی اُس کے دل میں اپنے دونوں بھائیوں
کے لئے بھی نفرت کا جذبہ جاگ اُٹھتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے بھائیوں کو بے حد چاہتی
تھی ـــــ یہ کیسے نشان ہیں، یہ کیسی زندگی ہے، یہ کیسے بھائی ہیں ـــــ اور پھر اس
عمر میں ایک بھائی کی ضرورت نہیں ہوتی، ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کانتی
بھی زندگی کے اُس ساحل پہ کھڑی تھی جہاں بھائیوں کے پیار اور سہارے کے
ساتھ ساتھ ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ مل کر زندگی کا دُکھ درد
جیون کا سُکھ، خیالات اور جذبات بانٹے جاسکیں۔ اور شاید اسی لئے وہ اُداس
اُداس اور کھوئی کھوئی سی رہتی۔ اُس کے بھائیوں کو کانتی کی اس اُداسی سے
نفرت تھی۔ وہ اُسے ہنستے، مسکراتے دیکھنا چاہتے تھے ـــــ لیکن وہ دونوں
کانتی کے اُس جذبے سے بے خبر تھے۔ وہ تو اپنے باپ کا انتقام لینے میں کھو
گئے تھے۔ تاریکیوں میں گم ہو گئے تھے۔ اُن کا باپ بھی اپنے وقت کا ایک مشہور
ڈاکو تھا جو ایک ٹکراؤ میں پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اپنے باپ کا انتقام لینے
لیتے انہوں نے اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کو لوٹا تھا۔ کتنے معصوموں کی جانیں

لی تھیں ۔ سوچتے سوچتے کانتی کا دل بھر آیا ۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

"سُدھیر ــــــ" اُس کی نگاہوں کے سامنے سُدھیر کا بے حد پیلا چہرہ پھر گیا ۔

"میرا بھائی ــــــ" وہ چیخی ۔ اپنے زخمی بھائی کے لئے اُس کے دل میں پیار کا سیلاب اُمڈ آیا ۔ وہ اپنے آپ کو بھول گئی ۔ اپنے وُجود کو بھول گئی ۔ اُس زندگی اُس ماحول کو بھول گئی جس سے وُہ نفرت کرتی تھی ــــــ !

ایک تاریک سے اندیشے نے اُس کے دل میں جگہ کر لی ۔ کہیں راستے میں راجُو کے آدمی پتا کا انتظار کر رہے ہوں تو ــــــ ؟ لیکن یہ اندیشہ اُس کے دل میں زیادہ دیر نہیں رہ سکا ۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی بہادر ہے ۔ وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتے ہیں ۔ وہ پھر اپنے بھائی کے قریب چلی آئی ۔ زمین پہ بیٹھ کر اونگھنے لگی ۔ جب نیند سے بیدار ہوئی تو رات اُتر آئی تھی ! رات کے اِس اندھیرے سے وہ ہمیشہ نفرت کرتی تھی ۔ کیونکہ رات کے اسی اندھیرے میں اُس کے بھائی خون خرابہ اور ڈکیتی پہ اُتر آتے تھے ــــــ کاش دُنیا میں صرف دن کی ہی صاف و پاک روشنی ہوتی ۔ ناپاک اندھیرا نہ ہوتا ــــــ اُس نے سُدھیر کی طرف دیکھا ۔ وہ اب بھی بے ہوش تھا ۔ آگ اب بھی جل رہی تھی ۔ وہ آگ کے سامنے آ گئی ۔ اس میں اور لکڑیاں ڈال دیں صبح سویرے اُٹھ کر گرم پانی سے سُدھیر کا مُنہ صاف کیا اور آہستہ سے بڑبڑائی ــــــ

"بھیّا میں تمہیں زندہ رکھوں گی ــــ زندہ ۔ کسی بھی قیمت پہ ــــــ !"

دن ویسے ہی گزرا جیسے کل گزرا تھا ۔ رات کو جب اس نے لکڑیوں کا اندازہ لگایا تو اُسے محسوس ہُوا کہ لکڑیاں بالکل ہی کم ہیں ۔ اس ڈر سے کہیں آگ نہ بجھ جائے اور سُدھیر کو ٹھنڈ نہ لگ جائے ، اُس نے ضرورت سے زیادہ لکڑیاں استعمال کی تھیں ۔

وہ گھبرا سی گئی۔ مگر یہ سوچ کر کہ کل سویرے جنگل سے اور لکڑیاں مل جائیں گی اُس نے
اطمینان کا سانس لیا۔

کہیں آگ بجھ نہ جائے، وہ اسی خوف سے ساری رات سو نہ سکی۔ صبح
کے وقت کچھ اونگ سی گئی۔ نیند سے اُٹھ کر سب سے پہلے کانتی نے ساری لکڑیاں
آگ پر ڈال دیں۔ آگ کو خوب تیز کیا اور خود لکڑیوں کی تلاش میں باہر نکلی۔ اُس
کے پاس کوئی کلہاڑا نہ تھا۔ اس نے دُور دُور تک اپنی نظریں دوڑائیں۔ زمین پر
لکڑیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لمبے لمبے درخت تھے۔ اُس نے درخت پر
چڑھنے کی کوشش کی۔ وہ ناکام ہو گئی۔ اُس نے ایک آدھ شاخ کو ہاتھ سے پکڑنا
چاہا وہ ایسا نہ کر سکی ـــ!

وہ گھبرا گئی ـــ!!

اگر لکڑیاں نہ ملیں تو ـــ وہ سردی سے سدھیر کو کیسے بچا سکے گی!
ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ اور
چند ٹکڑوں کے سوا اُس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ آسکا تھا۔

وہ رونے کے انداز میں چیخنے لگی -!

"پتا، پتا ـــ پتا ـــ پتا ـــ! مگر پتا کہیں بھی نظر نہ آیا۔ تنہائی اور
ناکامی نے اُس کے دل پر ایک شدید صدمہ پہنچا دیا تھا۔ جنگل میں پرندوں کی
آواز ایک ہی آواز تھی جو اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ آخر وہ کیا کرے؟
اُس کے سامنے سدھیر کی صُورت پھر گئی۔ جیسی زندہ لاش! اب آگ بہت
کم رہ گئی ہو گی۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی ـــ اور

اگر پنّا نہ آیا، ڈاکٹر نہ آیا ۔۔۔ تو ۔۔۔ ؟

سُدھبر ۔۔۔ کانتی کے مُنہ سے ایک لمبی چیخ نکل گئی ۔

دفعتاً اسے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سُنائی دی ۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی گمنام سی چمک آ گئی ۔ وہ چیخ اُٹھی ۔

" پنّا ۔۔۔ پنّا ۔۔۔ پنّا ۔۔۔ آواز اور قریب ہو گئی اور تیزی سے بھاگتا ہُوا ایک سوار نظر آنے لگا ۔ وہ حیران ہو گئی ۔ آخر پنّا اکیلا کیوں ہے ؟ ڈاکٹر کیوں نہیں آیا ؟

" پنّا ۔۔۔" وہ ایک بار پھر چیخی ۔ گھوڑ سوار یکدم رُک گیا ۔ اُس کے کاندھے پر بندوق لٹک رہی تھی ۔ کانتی فوراً جان گئی کہ وہ پنّا نہیں ہے ۔

" مجھے لکڑیاں چاہئیں ۔۔۔ لکڑیاں ۔۔۔" وہ بھرّائی آواز میں چیخی ۔

اجنبی خاموش رہا ۔ کانتی کو دیکھتا رہا ۔

وہ اس کی نظروں سے گھبرا سی گئی ۔ شرما سی گئی ۔

" مجھے لکڑیاں چاہئیں ۔۔۔" وہ پھر چیخی ۔

" سارا جنگل لکڑیوں سے بھرا پڑا ہے لڑکی ، تم چیخ کیوں رہی ہو ۔۔۔" اجنبی دھیمی آواز میں بولا ۔

" مگر میرے پاس کاٹنے کے لئے کچھ نہیں ہے ۔"

وہ پھر دیکھتا رہا ۔

" بھگوان کے لئے تھوڑی لکڑیاں کاٹ کے دے دو ۔ میرا بھائی سردی سے مر رہا ہے ۔"

"کہاں ہے وہ ؟"

"وہاں — اُس خیمے میں "

"مجھے دکھاؤ —" وہ اپنے گھوڑے سے اُتر آیا۔ اپنے ہاتھ میں کانتی کا ہاتھ لیا۔ کانتی کے سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی ۔ مگر دوسرے لمحے اُس کا چہرہ سخت ہو گیا۔ اُس نے چاہا ہاتھ چھڑا لے مگر یہ سوچ کر کہ وہ اکیلی ہے، اُسے لکڑیوں کی ضرورت ہے وہ خاموش رہی ۔

جب اندر جا کر اجنبی نے سُدھیر کو دیکھا وہ فوراً بول اُٹھا ۔

"کیا نام ہے تمہارا ؟"

" کانتی — یہ میرا بھائی سُدھیر ہے ۔ گولی لگ گئی ہے اِسے ۔"

وہ خاموشی سے کبھی سُدھیر اور کبھی کانتی کو دیکھتا رہا ۔

"میرا بھائی پتا ڈاکٹر کو لینے گیا ہے ۔ وہ آتا ہی ہو گا ۔"

اجنبی اب کی بار بھی خاموش رہا ۔

"سُدھیر کو راجو نے گولی ماری ہے ۔ بھگوان کرے وہ مر جائے ۔ اُس کے ہاتھ کٹ جائیں ۔"

اجنبی کی آنکھوں میں ایک زبردست چمک پیدا ہو گئی ۔ نفرت کی چمک، موت کی چمک، اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اُس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے لرز گئے ۔ وہ کسی اُلجھن میں ڈوبا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا ۔ دفعتاً اُس کی آنکھوں کی چمک دھیمی پڑ گئی ۔ جیسے اُس نے من ہی من میں کوئی فیصلہ کر لیا ہو ۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی ۔

"تم ٹھہرو میں ابھی لکڑیاں لا کے دیتا ہوں" وہ تیزی سے مڑا۔
سکانتی نے آگ کی طرف دیکھا۔ وہ اب ختم ہونے ہی کو تھی۔ وہ جلدی جلدی سُدھیر کے پاس گئی۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا اور اپنے ہاتھوں کی رگڑ سے چہرے کو گرم کرنے لگی۔ وہ حیران تھی آخر پتا کیوں نہیں آیا۔ آج تیسرا دن تھا اب تک تو اُسے آجانا چاہیے تھا۔
"کہیں راجُو نے ۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔" وہ خود ہی بول اُٹھی ۔۔۔ "یہ ناممکن ہے۔ وُہ پتا کو نہیں مار سکتا۔" وہ سوچنے لگی۔ اگر یہ اجنبی نہ آیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ سُدھیر بھگوان نہ کرے مر ہی گیا ہوتا۔
چند لمحوں کے اندر اندر اجنبی واپس چلا آیا۔ اُس نے خیمے کے اندر لکڑیوں کا ڈھیر جمع کر دیا۔ سکانتی کی آنکھیں خُوشی اور تشکر سے چمک اُٹھیں۔ اُس کی زبان پر شکریہ کے دو لفظ کئی بار آئے مگر ہر بار زبان ادا کئے بغیر ہی خاموش ہو گئی۔
اجنبی کھڑا۔ کبھی سکانتی کو دیکھ رہا تھا اور کبھی سُدھیر کو ۔۔۔!
"میرا بھائی آتا ہی ہو گا۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔"
وہ سُنتا رہا۔
"تم اُس کا انتظار کرو گے نا؟" وہ عجیب انداز میں بولی۔
"انتظار کر کے کیا کروں گا" وہ آہستہ سے بولا۔
"تم نے میرے بھائی کی جان بچائی ہے نا۔ تم جو چاہو وہ تمہیں دے گا۔"
"میں جو چاہوں وہ مجھے ملے گا۔۔۔؟" اُس نے سکانتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

کانتی شرما گئی۔

وہ دونوں خیمے کے باہر کھڑے ہو گئے۔

"مَیں تمہارے احسان کا بدلہ کیسے چُکا سکتی ہُوں"۔ وہ آہستہ سے بولی۔

اور پھر دونوں چونک پڑے۔ ایک گولی سرسراتی ہوئی دونوں کے سروں کے بیچ

میں سے گزر کر نکل گئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا تھا۔ کہ وہ دونوں حیران رہ گئے

کانتی نے پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ دُور اُسے اپنا بھائی پنّا اور ڈاکٹر دکھائی دیئے۔

پنّا کے ہاتھوں میں بندوق تھی۔ وہ زور زور سے چیخی ۔۔۔ "پنّا پنّا ۔۔۔"

دفعتاً اُس کو اپنے بالوں پر سخت گرفت کا احساس ہُوا۔ وہ چونک گئی۔

"لڑکی میں جا رہا ہوں"۔

"لیکن ٹھہرو ۔۔۔ تم کون ہو؟"

"راجُو ۔۔۔!"

"راجُو ۔۔۔ تم راجو ہو ۔۔۔؟" لیکن اجنبی چھلانگ لگا کر گھوڑے پر سوار

ہو کر جنگل کی وسعتوں میں کھو گیا تھا۔

اور کانتی بھیگی ہوئی آنکھوں سے گولیوں کی بوچھاڑ میں اُسے الوداع کہہ

رہی تھی ۔۔۔ !!

● ●

رات کافی بھیگ چکی تھی۔

بوڑھے پادری البرٹ نے اجنبی کو چاند کی زرد روشنی میں اپنے مکان کے سامنے باغ میں ٹہلتے دیکھا تو اُسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک پُرسکون جھیل میں پتھر ڈال دیا ہو۔ اُس نے فوراً کمرے کی کھڑکی بند کی۔ وہ جانتا تھا اجنبی اپنے آپ سے بڑبڑا رہا ہوگا۔ مگر کیا؟ البرٹ نے یہ جاننے کی کئی بار کوشش کی تھی مگر جان نہ سکا تھا ——— !

کرسچین کالونی سمندر کے مشرقی کنارے پر واقع تھی اور وہ کالونی کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے نوکر کے ساتھ رہتا تھا۔ اِس کی عمر ۶۰ سال کے قریب تھی۔ اُس کی موٹی گہری آنکھیں اِس قدر سُرخ تھیں کہ ہمیشہ یہ گمان ہوتا کہ اِس کے جسم کا سارا خُون آنکھوں میں سمٹ کر آگیا ہو۔ وہ کیا کرتا تھا، کہاں سے آیا

آیا تھا۔ کالونی میں یہ کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ دن میں کسی نے اُسے اپنے مکان
سے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب سے وہ کرسچین کالونی میں
۔ہنے کے لئے آیا تھا، پادری البرٹ اُس کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ یہ راز
جاننے کے لئے پادری نے اُس کے نوکر کے ساتھ بات چیت کرنے کی بھی کوشش
کی۔ مگر اُسے زندگی کا ایک بہت بڑا صدمہ ہوا۔ اجنبی کا نوکر بہرا بھی تھا اور
گونگا بھی —— ! چند ہی دنوں کے اندر اندر کالونی کے سارے لوگ اجنبی سے
ڈرنے لگے۔ ایک خاموش چھپا چھپا سا خوف تھا جو ساری کالونی پر چھا
گیا تھا۔ اجنبی ان سب چیزوں سے بے خبر، کالونی کے ماحول سے بے حس اپنے
چھوٹے سے مکان میں ہمیشہ کچھ سوچتا رہتا۔
بوڑھے پادری البرٹ نے سونے سے پہلے اپنے من ہی من میں فیصلہ کر لیا
"کچھ بھی ہو کل سویرے میں اس اجنبی سے ملوں گا۔ اُس سے باتیں کروں گا۔
اس کا حال جاننے کی کوشش کروں گا۔" یہ سوچ کر وہ میٹھی گہری نیند سو گیا۔
صبح سویرے پادری البرٹ جلدی سے تیار ہو کر اجنبی کے ہاں چلا گیا۔
اندر جانے سے پہلے اس نے چند لمحے سوچا کہ شاید اجنبی بُرا محسوس کرے، شاید
وہ تنہائی پسند ہو۔ مگر اُسے اپنا رات کا فیصلہ یاد آیا اور اُس نے اندر جا کر
دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ وقت اُس نے جان بوجھ کر منتخب کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا
تھا کہ اجنبی کا گونگا اور بہرا نوکر اس وقت گھر میں نہیں ہوگا۔
چند لمحوں کے بعد ایک موٹی سی کھردری آواز آئی۔
"کون ہے ؟"

"میں ہوں آپ کا ہمسایہ پادری البرٹ ـــــ ذرا دروازہ کھول دیجئے"۔
شاید اجنبی نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا۔ اِسی لئے دروازہ کھلنے میں ذرا دیر ہوئی۔

دروازہ کھلا۔ دونوں کی آنکھیں مل گئیں۔ پادری کی آنکھوں میں پیار تھا۔ اجنبی کی آنکھوں میں نفرت تھی ـــــ پادری البرٹ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اُسے محسوس ہوا کہ اجنبی اُسے دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔

"میرا آنا آپ کو گراں تو نہیں گزرا؟" پادری نے کہا۔

"او ـــــ" اجنبی نے فوراً جواب دیا۔ "بالکل نہیں، تشریف لائیے نا"۔

پادری اندر آیا۔ کمرے میں ایک ناریک سی خاموشی چھا گئی۔ دونوں شاید ایک دُوسرے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ آخر پادری ہی بول اُٹھا۔

"کل اتوار ہے آپ چرچ چلئے نا؟"

"میں کرسچین نہیں ہوں"۔ وہ ہلکی سی آواز میں بولا۔

"میں آپ کو کرسچین بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ ہمیشہ اکیلے بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کی کسی سے جان پہچان ہے نہ کچھ اور ـــــ اِس چھوٹی سی کالونی میں ہم سب پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔ اتوار کو کالونی کے تقریباً سب ہی لوگ چرچ آتے ہیں۔ اگر آپ بھی آتے تو . . . . !"

وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر بولا "میں ضرور آنے کی کوشش کروں گا ـــــ ویسے یہ مندر، یہ مسجد، یہ گرجے مجھ جیسے آدمی کے لئے نہیں ـــــ!" پھر وہ اچانک بات بدل کر بولا۔

"معاف کیجئے۔ میں آپ کو چائے کی پیالی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ میرا نوکر شاید باہر گیا ہُوا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ـــــ کل ضرور آنا ـــ" یہ کہہ کر پادری چلا گیا۔

دوسرے دن دیر تک پادری اجنبی کا چرچ میں انتظار کرتا رہا۔ وہ کل کی مختصر سی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کیسی ملاقات تھی کہ اُس نے اجنبی کا نام تک بھی نہ پُوچھا تھا ـــ!

ایک ایک کر کے سارے لوگ چلے بھی گئے مگر پادری البرٹ کو اجنبی کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مایُوس ہو کر وہ بھی واپس چلا گیا۔ اُس کے ذہن میں ایک نیا خیال اُبھرا کہ اجنبی ایسے آدمی کو مُنہ لگانا ہی اچھا نہیں۔

چند ہفتے سکون سے گزر گئے۔

پھر ایک دن اچانک ساری کالُونی میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ پولیس اجنبی کو تلاش کر رہی ہے۔ پادری البرٹ گھبرا سا گیا۔ کہیں اس آدمی نے خون تو نہیں کیا ہے، کہیں کوئی چوری تو نہیں کی ہے۔ اِسی لئے شاید یہ دن میں چھُپا رہتا ہے۔ یہ ضرور قانون سے بھاگا ہُوا کوئی مجرم ہوگا۔ مگر پادری کے سارے شکوک ختم ہو گئے جب پولیس انسپکٹر شنکر ناتھ سے اُس کی مُلاقات ہوئی۔

"جی ہاں! انسپکٹر پولیس صاحب بولا۔ "میں اس آدمی کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ خاموشی کی زندگی بسر کر رہا ہے ـــ یہ قاتل ـــ"

"قاتل" پادری البرٹ آتش فشاں پہاڑ کی طرح چیخ اُٹھا ـــ" یہ قاتل ہے اور آپ نے اسے چھوڑ رکھا ہے۔ قتل کی سزا موت ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا؟

"جی ہاں!" شنکر ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا — "یہ آدمی چودہ سال کی جیل کاٹ کر یہاں آیا ہے جناب۔ یہ قتل کی سزا بھگت کر اب گمنامی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر اس نے قتل کیوں کیا؟"

"قتل کیوں کیا؟ اس کا جواب صرف وہی دے سکتا ہے۔ البتہ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صرف پچیس سال کا جوان تھا جب اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔"

"بیوی کو قتل کیا تھا؟"

"جی ہاں! کہتے ہیں کہ اس کی بیوی بہت ہی خوبصورت تھی۔ شادی کے صرف ایک سال بعد ایک رات اس نے اپنی بیوی کا خون کر دیا۔ وجہ بتانے سے اس نے انکار کیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ خود ہی پولیس کو اطلاع دی۔ چودہ سال کی سزا کاٹ کر اب رہا ہو کر آیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب یہ ایک اچھے شہری کی طرح زندگی گزار رہا ہے۔ آج اس کی فائل میں یہ سب کچھ نوٹ کر لوں گا۔"

شنکر ناتھ تو اجنبی کی کہانی سنا کر چلا گیا۔ مگر اس رات بوڑھا پادری البرٹ سو نہ سکا۔ رات بھر وہ اجنبی کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر اس نے بیوی کو کیوں مارا اور اب لوگوں سے دور کیوں بھاگتا ہے؟

اتوار کو پادری کا جی چاہ رہا تھا کہ اجنبی کو چرچ لے ہی جائے مگر نہ جانے کیوں وہ اپنے دل کا ساتھ نہ دے سکا — چرچ پہنچ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اجنبی کو چرچ کے بالکل سامنے ایک کونے میں سر جھکائے

کھڑا دیکھا - لوگ اجنبی کے بارے میں سرگوشیاں کر رہے تھے -
میری کہہ رہی تھی ـــــــ " قاتل ہے، خوبصورت بیوی کو قتل کیا تھا نا "
" پتہ نہیں آج کیسے یہاں چلا آیا " ڈی سوزا نے آہستہ سے کہا ـــــ

" مجھے تو ڈر لگ رہا ہے "
" تمہیں ڈرنا ہی چاہیئے ۔ آخر تم بھی کافی خوبصورت ہو " شہزادہ نے

چوٹ کی -
پادری اجنبی کے قریب آیا -
" تمہارا یہاں آنا مبارک ہے دوست " پادری کے لہجے میں پیار تھا -
اجنبی نے پادری کو گھور کر دیکھا - پادری نے اپنی بات جاری رکھی -
" یہ خدا کا گھر ہے - یہاں سب برابر ہیں - تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے خداوند
کے سامنے رکھو - وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا "
پادری چرچ کے اندر چلا گیا - جب باہر آیا تو اجنبی کب کا جا چکا تھا -
وہ رات پادری البرٹ کے لئے تیارت کی رات تھی - اس رات اس نے
معمول کی طرح اجنبی کے بڑبڑانے کی آواز سنی - مگر آج یہ آواز واضح تھی، صاف
تھی - وہ اجنبی کی ایک ایک بات سن سکتا تھا - وہ کہہ رہا تھا -
" میں نے تمہیں مارا - ہاں ہاں یقین جانو، وہ میرا پاگل پن ہی تو تھا ورنہ
تم جیسی بیوی کہاں ملتی ہے - ایک ذرا سی غلط فہمی، ایک ذرا سی غلطی اور اتنی
بڑی سزا ـــــــ میں نے تمہیں دھوکا دیا - میں گناہ گار ہوں ـــــــ جیل کی
سزا میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی - مگر اب تم کیوں میرے پیچھے پڑی ہو - بتاؤ نا -

ہٹاؤ ـــــ خدا کے لئے جاؤ۔ مجھے سکون سے مرنے دو ـــــ جاؤ ـــــ جاؤ۔!"

وہ زور سے چیخا۔ پادری البرٹ نے جلدی سے کھڑکی کھولی۔ اجنبی اپنے باغ میں کھڑا تھا۔ وہ چند منٹ بعد لڑکھڑایا اور دُوسرے لمحے زمین پر گر پڑا۔ پادری البرٹ گھبرا گیا۔ جلدی سے باغ میں چلا آیا۔ اجنبی کو اُٹھا کر اُس کے بستر پر لٹا دیا۔ اُس رات صُبح تک اجنبی ہوش میں نہیں آیا۔ وہ بے ہوشی میں بھی بڑبڑا رہا تھا۔

ـــــ جاؤ ـــــ جاؤ ـــــ !!

سویرے جب وہ ہوش میں آیا تو سب سے پہلے اس نے پادری کو دیکھا۔

"میں کہاں ہوں ؟"

"گھبرائیے مت آپ اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"آرام کی ـــــ ؟ مجھے کیا ہوا ہے ' میں تو اچھا ہوں۔"

"واقعی آپ بالکل اچھے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

چند منٹ پھر وہی پُر اسرار تاریک خاموشی چھائی رہی۔

پادری نے کہا ـــــ " آپ ہم سب لوگوں کو غیر سمجھتے ہیں۔ ماضی نے اگر آپ کو کچھ دُکھ دیئے ہیں تو اُنہیں بھول جانے کی کوشش کیجئے۔"

"لیکن بھول کیسے سکتا ہوں !"

آپ ہمیشہ تنہا ' اکیلے اور اُداس رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملئے۔ اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو جایئے۔ شاید آپ اپنا ماضی بھول لئے ہیں سکا سباب ہو جائیں!"

وہ خاموشی سے پادری کو دیکھنے لگا۔ پھر اچانک بولا۔

"آپ میرے ماضی کے بارے میں کیا جانتے ہیں ؟"

"ظاہر ہے بہت کم جانتا ہوں لیکن جتنا بھی جانتا ہوں اُس سے یہی پتہ چلتا ہے آپ کو تنہائی کی نہیں، ساتھی کی ضرورت ہے۔ جوانی میں ہر ایک سے غلطی سرزد ہوتی ہے کسی سے چھوٹی، کسی سے بڑی —— آپ بھول جائیے !!"

"جتنا بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں وہ اتنی ہی قریب آتی ہے۔ پادری میں نے ان گندے ہاتھوں سے اس کا قتل کیا تھا —— میں پاگل ہو گیا تھا بالکل پاگل —— وہ معصوم تھی، بے قصور تھی! پندرہ برس ہو گئے ہیں لیکن میں ہمیشہ اچانک رات کو جاگ جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے وہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔ روتا ہوں —— کل تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی چیخ رہی ہو —— آؤ، ایک بار پھر مجھے قتل کر لو —— آؤ ——"

وہ دیر تک روتا رہا۔ پادری دیر تک سمجھاتا رہا۔

اُس دن کالونی کے سارے لوگ حیران ہو گئے جب اُنہوں نے اجنبی کو پادری البرٹ کے ساتھ گھومتے دیکھا۔ اُس دن وہ پادری کے ساتھ چرچ گیا ساتھ والے سمندر کے کنارے وہ لوگوں کے نہانے کا تماشہ بھی دیکھتا رہا۔ پادری البرٹ نے اجنبی کو لوگوں سے ملایا۔ چند ہی دنوں کے اندر اندر اجنبی لوگوں سے اتنا گھل مل گیا کہ لگتا تھا جیسے وہ مدتوں سے اسی کالونی میں رہتا آیا ہو۔ اور وہ بھی اُن میں سے ہی ایک ہو۔

وقت خاموشی کے ساتھ گذرتا رہا۔

اتوار کی ایک خوبصورت سی شام کو بہت سے لوگ سمندر کے کنارے بیٹھے بچوں کے نہانے کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا پادری البرٹ کہہ رہا تھا۔

"کاش اس سمندر میں خطرناک شارک (مچھلیاں) نہ ہوتیں تو آج ہم بھی نہا لیتے!"

سیمی نے ایک قہقہہ لگا کر کہا ——— "پادری بچے تو نہا رہے ہیں۔ شارک تو کنارے سے دُور ہیں۔ کوئی آگے نکل جائے تو دُوسری بات ہے۔"

"ہاں ——" ڈاکٹر ستورالی نے کہا ——— "دراصل ہم بُوڑھے ہو گئے ہیں۔ کسی زمانے میں ہم بھی اسی سمندر میں نہاتے تھے۔ پھر جب شارک ہم لوگوں کی طرف چلی آتیں، ہم بھاگ جاتے ——— وہ وقت ہی الوکھا تھا۔"

"یہ سب بچپن کی یادیں ہیں۔" اجنبی نے بحث میں شامل ہو کر کہا ——— "بچپن کی یادیں حسین ہوا کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے بُڑھاپا اُن یادوں کے سہارے ہی گزر جاتا ہے۔"

"صحیح ہے۔" پادری البرٹ نے کہا۔ "مگر . . . !"

اچانک وہاں شور برپا ہُوا۔ لوگ چیخنے لگے۔

"مونا ——— مونا ——— مونا ———"

"مونا ——" اجنبی نے چیخ کر کہا ——" کون مونا، کیسی مونا ——"

پادری البرٹ پاگلوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ "کیا ہے، کیا ہے؟"

"وہ دیکھئے، مونا سمندر کے بیچ شارکوں سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ——— وہ دیکھئے، وہ چیخ رہی ہے ———"

"ارے کوئی ناؤ تو لے آؤ ـــــ"

"میری بچی ـــــ مونا ـــــ مونا ـــــ" شاید مونا کی ماں تھی۔

"میں مونا کو بچاؤں گا، میں مونا کو بچاؤں گا ـــــ" اجنبی نے کہا۔

"یہ موت کے منہ میں کود رہا ہے، پاگل ہے، مت جانے دو اُسے۔ مونا نہیں بچ سکتی۔ یہ بھی مارا جائے گا۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

مگر اجنبی سمندر کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ اُس نے چھوٹی سی لڑکی کو سینے سے لگایا اور کنارے کی طرف مُڑا۔

اچانک کوئی چیخا ـــــ "وہاں پانی سُرخ ہو رہا ہے۔ خُون ہے خُون"۔

اجنبی مونا کو لے کر آہستہ آہستہ کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ کنارے کے قریب پہنچ کر مونا کی ماں نے اپنی بچّی کو سینے سے لگایا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اجنبی کو پانی سے باہر کھینچ لیا گیا۔ مگر اُس کی ٹانگیں ہی غائب تھیں۔ اُس کے جسم سے خُون کا ایک آبشار گر رہا تھا۔ لوگ بے حس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اچانک پادری البرٹ پاگلوں کی طرح چیخا ـــــ "البرٹ یہ کیوں کیا اجنبی۔ ۔ بتاؤ، تم نے کیوں کیا ایسا ـــــ!"

اجنبی درد سے کراہ اُٹھا اور ہلکے سے بولا۔

"پادری اُس کا نام بھی تو مونا ہی تھا۔

پادری کو محسوس ہوا، جیسے سمندر کی لہریں اچانک ساکت ہو گئی ہوں!

● ●

سُورج کا سونا پگھل چُکا تھا۔

اور اب شام کے سائے نیلی جھیل کی سطح پہ پھیل رہے تھے۔ جھیل کے کنارے کیکر کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر حمید نے جیب سے امریکن سگریٹ کی لمبی ڈبیہ نکال لی۔ لیکن دُوسرے لمحے اُسے یاد آیا کہ وہ اپنا لائٹر ٹورسٹ سنٹر کے ریسٹوران کے کونٹر ہی پہ چھوڑ آیا ہے۔ اُس نے اپنے نتھنوں کو سکیڑا اور کیکر کے شگوفوں کی خوشبو سُونگھ کر سوچنے لگا۔

اب کیا ہوگا — ؟

"اب کیا ہوگا — ؟" وہ بڑبڑایا۔ آج جو کچھ بھی ہُوا تھا اس بارے میں حمید نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر اب تو حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے تھے، ماحول ہی ایسا بن گیا تھا — وہ سوچ رہا تھا آخر آج تک کی سما

یہ رُخ کیوں پوشیدہ تھا۔ نکی نے لبنیٰ کا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا ــــ اور ــــ

اور ــــ کہکشاں ؟

ہر سوال اُس کے سامنے تھا۔ ہر سوال کا جواب خود ہی اُس کے ذہن میں جنم لیتا اور خود ہی ذہن کے کسی گوشے میں کھو جاتا۔ اس نے سگریٹ کی ڈبیہ جیب میں ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے ریستوران کی جانب چل پڑا۔ ٹورسٹ سنٹر پہنچ کر اُس نے خلافِ معمول سنٹر کو بالکل خالی پایا۔ ریستوران کچھ اُداس اُداس سا، کچھ تھکا تھکا سا نظر آرہا تھا۔ سارے نوکر باہر لان میں بیٹھے شاید ایک دوسرے میں اپنا دُکھ درد بانٹ رہے تھے۔ حمید کے غصّے کا پارہ یکدم چڑھ گیا۔ اور وہ چیخ اُٹھا۔

"کیا بات ہے، تم لوگ وہاں کیا کر رہے ہو"۔ سارے نوکر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

حمید اپنے کونٹر پہ بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

"کافی"

کافی آگئی۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ لبنیٰ نے کس انداز سے کہا تھا۔

"جب میں مر جاؤں گی تو میری آتما ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی حمید"

"لبنیٰ ــــ" حمید نے کہا تھا۔

"ہاں حمید، تم میرے دیوتا ہو۔ میں نے اگر زندگی میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ تم ہو ــــ میرے جسم کے ایک ایک حصّے پر تمہارے ہاتھوں کے نشان ہیں۔ تمہارے پیار کی مہریں ثبت ہیں۔ تم نے میری زندگی کی ویرانیوں کو شادابیوں میں بدل دیا۔ میرے خیالوں اور میری مسکراہٹوں میں رنگینیاں بھر دیں۔ میرے احساس

کو نکھارا......!"

یہ سُن کر حمید اپنے مخصوص انداز میں مُسکرایا۔ لبنا کی موٹی جھیل ایسی گہری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ دیکھ کر پھر مُسکرایا۔ لبنا کے ہونٹ نیم وا ہو گئے اور حمید کی گردن میں بھرے بھرے نیم عُریاں بازو جھول گئے۔ اور پھر اچانک لبنا کی گرفت نرم پڑ گئی اُس نے اپنا پُرانا سوال دُہرایا۔

"حمید، تم مجھ سے شادی کر لو۔" یہ سوال سُن کر حمید کو محسوس ہوتا جیسے کسی غیبی طاقت نے اُس کی قوّتِ گویائی ہی چھین لی ہو۔ جیسے اُس کے دِل کے دروازے کو زنگ لگ گیا ہو — جب بھی لبنا نے یہ سوال کیا تھا اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک صُورت پھر گئی تھی۔

ایک جانی پہچانی صورت۔

کاجل سے رنگی ہوئی آنکھوں پر جُھکی جُھکی پلکیں۔

سُنہری تاروں جیسے بِکھرے بِکھرے بال۔

ہونٹوں پر تبسّم کا رس!!

کہکشاں — !!!

"صاحب بِل لکھ دیجیے۔" اچانک ویٹر کی آواز سُن کر وہ چونک پڑا۔

ویٹر بِل لے کر چلا گیا۔ وہ پھر اپنے خیالوں کی دُنیا میں کھو گیا۔ اب بھی اُس کے خیالوں کی دُنیا میں لبنا اور "نگی" گھوم رہے تھے۔ وہ دونوں گُل کیکر کی خوشبو کی طرح اُس کے خیالوں میں بس گئے تھے۔ اور اُسے ایک ایسے لمحے کی یاد دلا رہے تھے جس نے ایک ملاقات کو زندگی بخش دی تھی — ایک لمحہ — ایک ملاقات —

ایک کہانی . . . .

اس روز بھی وہ اسی طرح ریستوران کے کونٹر پر بیٹھا ریڈیوگرام سے اپنا من پسند ریکارڈ سُن رہا تھا۔

" THERE WILL NEVER BE ANY ONE ELSE BUT YOU "

ایک عورت کونٹر کے قریب آئی ۔

" معاف کیجئے کیا آپ ہی ہوٹل کے مالک ہیں ؟"

" جی ہاں، فرمایئے، کیا خدمت کرسکتا ہوں ۔" حمید نے بالکل کاروباری رنگ میں جواب دیا ۔

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بات بدل کر بولی ۔

" یہ گانا بڑا ہی سویٹ ہے ۔" حمید چونک پڑا ۔ ریستوران میں اس کی مُلاقات ہر روز درجنوں ایسی عورتوں سے ہوتی تھی ۔ مگر یہ عورت کچھ بدلی بدلی سی کچھ عجیب عجیب سی نظر آئی ۔ ظاہر ہے وُہ خاموش رہا ۔ اِس کے ہونٹوں پہ کوئی بات آتے آتے رُک گئی ۔ اس نے اس عجیب سی عورت کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہا ۔ لیکن حیران رہ گیا ۔ وہ اب گانے کی موسیقی پہ اُنگلیاں بجا رہی تھی ۔

ریکارڈ ختم ہوگیا ۔

" دیکھئے ! کیا آپ ہمارے لئے رہنے کا انتظام کرسکتے ہیں ؟"

" جی نہیں ۔ اِس ریستوران میں رہنے کا کوئی انتظام نہیں ۔ کیوں ۔ آپ کہیں اور جگہ نہیں ملی ؟"

" جی نہیں ۔ سب ہوٹل بک ہیں ۔"

"اور ہاؤس بوٹ ۔" حمید نے کہنا چاہا۔

"میں ہاؤس بوٹ میں رہنا پسند نہیں کرتی ۔" اس نے حمید کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

حمید کچھ سوچنے لگا۔ وہ برابر حمید کو گھورے جارہی تھی ۔ جیسے اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ اور اب پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ حمید کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی ۔ وُہ بہت ہی خوبصُورت تھا۔ اُس کی صحت نے اُس کی خوبصُورتی میں اور بھی اضافہ کردیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسا سحر تھا کہ ہر کوئی اس سحر سے متاثر ہوجاتا۔

حمید نے ٹیلیفون اُٹھایا اور اپنے دُوسرے ہوٹل کے نمبر ملا دیئے ۔ اس کا دوسرا ہوٹل بھی بک تھا۔ بڑی مشکل سے اُس نے ایک کمرے کا انتظام کیا۔ وہ ابھی ٹیلیفون ہی کر رہا تھا کہ سفید لباس میں ملبُوس کالے سیاہ رنگ کا ایک بُوڑھا آدمی کاونٹر کے قریب آیا۔

"لبنا ڈیر کیا ہُوا ؟"

حمید ایک بار پھر چونک پڑا۔ تو اس عورت کا نام لبنا ہے ۔ لبنا تیزی سے مُڑی اور بولی ۔

"تم اِتنے ایڈیٹ ہو ۔" وہ آدمی بے بسی سے کبھی لبنا اور کبھی حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ حمید کو اس کی بے بسی پہ رحم آیا۔ اُس نے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے کہا ۔

"آپ کے کمرے کا انتظام "لیک ویو" میں ہوگیا۔ آپ میرا کارڈ لے لیجئے کمرہ نمبر تو آپ کو مل جائے گا۔"

"شکریہ"۔ لبنا نے کہا ۔ "تکلیف تو آپ کو ہوئی ہے ۔ میری کار باہر ہے ۔ کیا آپ وہاں تک میرے ساتھ چل سکیں گے ۔" اُس نے حمید کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا

کہ وہ انکار نہ کر سکا۔ ایک لمبی سانس لے کر اُس نے کہا۔

"او۔ کے"۔

"نکی تم یہاں ٹھہرو"۔ وہ تیزی سے بولی اور حمید کے ساتھ باہر نکل گئی۔

وُہ خاموشی سے کار چلاتی رہی۔ دفعتاً حمید نے پوچھا "یہ نکی کون ہے؟"

اس نے فوراً بات کاٹتے ہوئے کہا "بالکل ایڈیٹ ہے۔ ایک ہفتے سے کسی اچھے ہوٹل میں انتظام نہ کر سکا۔"

"کتنی دیر ٹھہریں گی آپ یہاں؟"

"کوئی دو مہینے کا پروگرام ہے"۔

"دیکھئے" لیک ویو" ذرا مہنگا ہوٹل ہے۔ تقریباً پچاس روپے۔۔۔۔"

"اِٹ از آل رائٹ"۔ اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

لبنا اور حمید کی یہ پہلی مُلاقات تھی۔ ایک لمحے نے امر ہو کر ایک ملاقات کو جنم دیا تھا۔ اِس مُلاقات نے اُن دونوں کو ایک دُوسرے کے قریب کر دیا۔ ہر شام لبنا کار لے کر چلی آتی اور ہر شام حمید کے ساتھ رات کی تاریکیوں میں کھو جاتی۔!

کبھی کبھی رات کی تاریکیاں کس قدر حسین ہو جاتی ہیں۔!!

ہر رات حمید جب لبنا کو اُس کے ہوٹل میں چھوڑ کر اپنے گھر پہنچتا تو سونے سے پہلے اپنے کمرے میں ٹیبل پہ رکھی ہوئی تصویر کی طرف گھُور کر کہتا۔

"کہکشاں، تمُ مجھے اپنی نیم وا آنکھوں سے کیوں دیکھ رہی ہو۔ میں تمہیں دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں؟ تمُ پونم ہو کہکشاں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا حمید تمُ سے دُور بھاگ رہا ہے۔ نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مگر کہکشاں تمُ مجھے جانتی ہو میری

کمزوریوں سے واقف ہو۔ مجھے ضرورت ہے کسی کے باہوں کے سہارے کی۔ کسی کی جو میرے دُکھ درد اور سُکھ کو سمجھ سکے۔ میرے قریب ہو کر بھی تم مجھ سے کتنی دور ہو۔ اور لبنا مجھ سے دُور ہو کر بھی کتنی قریب ہے۔ تم دُنیا سے ڈرتی کیوں ہو کہکشاں۔ لبنا کو دیکھو نا۔ وُہ کسی سے نہیں ڈرتی۔ سب کے سامنے میری باہوں میں باہیں ڈال کر چلتی ہے۔ اس پر میرا کوئی حق بھی نہیں۔ تم پر حق ہے، ادھیکار ہے۔ تم سے میں نے جب بھی کچھ اس قسم کی باتیں کیں تم نے رو رو کر جواب دیا۔ حمید میں سب کے سامنے بازاروں میں باہوں میں باہیں ڈال کر تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ ہوٹلوں میں نہیں جا سکتی ـــــ کہکشاں یہ تم کس دُنیا کی باتیں کرتی ہو۔ یہ تو آج سے پچاس سال پہلے کی باتیں ہیں۔ تمہیں تو آج سے پچاس سال پہلے پیدا ہونا چاہیئے تھا ـــــ"

دیکھتے دیکھتے حمید اور لبنا کے رومان کی بات سارے شہر میں پھیل گئی۔ حمید اس سے بے خبر نہ تھا۔ وُہ اپنے گھر میں ہونے والے ہنگامے سے بھی بے خبر نہ تھا۔ حمید کا اپنا گھر، اپنا خاندان صدیوں سے شرافت کا گہوارہ رہا تھا۔ اس کے خاندان کی اپنی عزّت تھی، اپنی انفرادیت تھی، اپنی جانکاری تھی۔ ایک گھر۔ ایک خاندان، جو ایک پُختہ مکان ہوتا ہے، جس کے بنانے میں وقت لگتا ہے، جس کی اُٹھان میں ایک ایک اینٹ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہیں کوئی اینٹ اُلٹی نہ لگ جائے۔ جس کے بنانے میں محنت، ایمانداری اور روپیہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ حمید صدیوں کی اس شرافت کا نیلام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وُہ نہیں چاہتا تھا کہ صدیوں سے بنائی ہوئی اس عمارت کو مسمار کر دیا جائے۔ لیکن اسے بچپن سے ہی ہوٹلوں کا ماحول ملا تھا۔

شروع سے ہی اُس نے ہوٹلوں کی زندگی دیکھی تھی۔ اس نے ہوٹلوں کے چکنے فرش پہ چکنے جسم والی نیم عریاں لڑکیوں کو ناچتے دیکھا تھا۔ زندگی کو بکتے اور خریدتے دیکھا تھا۔ کبھی اِس ٹیبل پہ۔ کبھی اُس ٹیبل پہ۔ کبھی اِس کمرے میں اور کبھی اُس کمرے میں۔ اسی وجہ سے کہکشاں سے اس کی پنپ نہ سکی تھی۔ وہ اس کی ہوتے ہوئے بھی اس کی نہ تھی۔ قریب ہوتے ہوئے بھی دُور تھی۔ کہکشاں کو ان نیم عریاں لڑکیوں سے نفرت تھی، نیم عریاں لباس سے نفرت تھی، نیم عریاں تہذیب سے نفرت تھی۔ اس نے اپنے تصور میں اپنی ہی ایک دُنیا بسا ڈالی تھی — ایک گھر۔ خوبصورت گھر۔ اس گھر میں خوبصورت خوبصورت بچے — پیار — محبت — رُوٹھنا — منانا — مگر حمید — ؟ وہ آج کا انسان تھا۔ آج کے انسان کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے اور پھر اگر عورت لبنا ہو۔ خوبصورت — نیم عریاں — مالدار — اسی لئے حمید لبنا کے نیم عریاں بھرے بھرے بازوؤں میں لہرا رہا تھا لیکن کبھی کبھی ایک عجیب سی اُلجھن میں پھنس جاتا۔ ایک عجیب سی یاسیت میں کھو جاتا۔ رات کی تاریکیوں میں شراب کے نشے میں دھت جب وہ گھر آتا تو گھر میں آتے ہوتے خاموش طوفان سے گھبرا جاتا۔ گھر کا ہر فرد خاموش تھا۔ اور حمید جانتا تھا جس دن یہ خاموشی ختم ہوگی اُس دن — اُس دن شاید اُسے خودکشی کرنی پڑے۔ وہ کہکشاں کی تصویر کی طرف دیکھ کر کہتا۔

"کاش تُو میرا کہنا مانتی"۔

ایک دن دبے لہجے میں لبنا نے حمید سے کہا۔

"میں تمہیں اپنی سلاخہ مِلز میں برابر کا شریک بنانا چاہتی ہوں"۔

حمید نے خاموشی سے سُنا اور اس رات خاموشی سے جلدی اپنے گھر چلا گیا۔ وہ سونے ہی جا رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

حمید نے دروازہ کھولا۔ نکی تھا۔

"لبنا آپ کو یاد کر رہی ہے، ابھی اسی وقت۔"

حمید نے کار نکالی۔ راستے میں نکی نے اُسے کہا۔ "دیکھئے حمید صاحب! میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں، آپ کلائنٹ ملز میں شراکت کا خیال چھوڑ دیجئے۔"

"آپ کے مشورے کا شکریہ۔" حمید نے کہا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ حمید کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ اُس نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ وہ لبنا کے ساتھ صاف صاف باتیں کرے گا۔ لیک ویو ہوٹل آ گیا اور لبنا کے کمرے میں پہنچ کر اس سے پہلے کہ حمید کچھ کہتا، لبنا کی نازک نازک باہیں اِس کی گردن میں حائل ہو گئیں اور وہ ان باہوں کے لمس میں کھو گیا۔

نیم تاریک کمرے میں ہلکے ہلکے لبنا کی آواز اُبھر رہی تھی۔

"حمید تم میری زندگی ہو —— تم میری زندگی ہو ——"

کئی دن گذر گئے۔

حمید کو اچانک کہکشاں کا خط ملا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے قابل نہ ہوں۔ شاید اِس لئے کہ میں تمہاری وہ ضرورتیں پُوری نہیں کر سکتی جو اِس وقت تمہاری محبوبہ پُوری کر رہی ہے۔ اور شاید تم سوچ رہے ہو کہ اِس لڑکی سے تمہارے تعلقات کی وجہ سے میں پریشان ہوں۔ یہ غلط ہے حمید۔ اگر تم ایسا سوچتے ہو۔ میں جانتی ہوں یہ آنکھوں کا سراب ہے۔

اس سنجیدگی پر۔"

"مرجائیں تمہارے دشمن ۔" لبنا نے اس کی آنکھوں کو اپنی آنکھوں سے چومتے ہوئے کہا۔

"حمید میں تم سے محبت کرتی ہوں ۔ تم میرے دیوتا ہو۔"

"میں جانتا ہوں ۔" حمید نے کہا۔

"تو تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے ۔" اس سوال پر حمید حسب معمول گھبرا گیا۔

"بولو، تم مجھ سے شادی کرو گے ۔ بولو نا میرے پرنس . . . "

حمید خاموش رہا۔

"میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا ہے، وہ تمہیں دوں گی ۔ اپنی کلائنٹ ۔ کاریں ۔ کوٹھیاں ۔ بنک بیلنس ۔"

"کاریں ۔ کوٹھیاں ۔ بنک بیلنس ۔" حمید نے کہا ۔" لیکن لبنا ڈیر محبت ان چیزوں سے خریدی نہیں جاتی ۔"

"حمید، میں تم سے محبت کرتی ہوں ۔ تم یقین کرو۔"

اچانک نگی کمرے کے اندر واپس چلا آیا۔

"YOU SHABY DOG" لبنا چلائی ۔" تم کیوں اندر آ گئے ؟"

نگی کھڑا ہنستا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی ہنسی میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ اور اس کا بوڑھا سیاہ چہرہ اور بھی سیاہ ہو گیا۔

"میں گندا کتا ہوں ۔" (ایک زوردار قہقہہ) ۔" سنو لبنا میں ہر چیز اپنی

زمین سے جب ہم چاند کی طرف دیکھتے ہیں وہ خوبصورت نظر آتا ہے لیکن جب کوئی چاند کو چاند کی زمین سے دیکھے گا وہ اس قدر خوبصورت اور حسین نظر نہیں آئے گا۔ تمہاری حالت تو اس وقت اس ناخدا کی سی ہے جس کی کشتی سمندر کے بیچ ہو، اور جسے آنے والے طوفان کا ہلکا سا خیال تک نہ ہو۔ نہیں وقت ہی وقت کی قدر کرنا سکھا دے گا حمید —— میں نے تم سے محبت کی ہے، عمر بھر کرتی رہوں گی میرے دل کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے ہیں . . . . . لیکن تم نے اپنی محبوبہ سے یہ تو نہیں کہا ہوگا۔ اور کیا لکھوں۔

حمید نے ایک بار، دو بار، کئی بار خط کو پڑھا —— میں نے تم سے محبت کی ہے —— میں جو تمہاری . . . . . یہ الفاظ اُس کے دماغ میں گونجتے رہے۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ لبنا سے ملنے کا وقت ہو گیا ہے اور وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ اُس نے لائٹر سے سگریٹ جلایا اور پھر کہکشاں کے خط کو لائٹر کے تیز شعلے پر رکھ دیا۔

آج لبنا کے کمرے میں "تکی" بھی تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ پینے لگے۔ دیر تک وسکی بہتی رہی۔ جام ٹکراتے رہے۔ لبنا اور حمید کی نگاہوں کی ہوس اشاروں ہی اشاروں میں اُڑتی رہی۔ حمید جب پی پی کر بہکنے لگا تو اُسے "تکی" کا وہاں بیٹھنا ناگوار سا لگا۔ حمید کو اب تک لبنا اور "تکی" کے تعلقات کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ نہ جانے اُن کا کیا رشتہ تھا۔ کئی بار اُس نے لبنا سے پوچھا بھی۔ مگر ہر بار اُس نے ٹال دیا۔ اچانک لبنا نے "تکی" کو کسی کام سے باہر بھیج دیا۔

"حمید" لبنا نے کہا۔ "آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"اوہو —" حمید مسکرایا —"آج یہ سنجیدگی کیسے، میرے اللہ میں کہیں مر نہ جاؤں

آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ مگر جان بوجھ کر خاموش رہا۔ تم بھی سنو حمید ـــ" وہ حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ " تم اس عورت سے شادی کرو گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

حمید نے نکّی کی طرف دیکھا اور تذبذب میں پڑ گیا ـــ نکّی نے بالکل ہی نیا روپ اختیار کیا تھا۔ کل کی نکّی اور اس وقت کی نکّی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

" نکّی ــــ" لبنا کی آواز سے کمرا تھرا اٹھا۔

" لبنا ــ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ آج مجھے کہنے دو۔ میں جانتا ہوں کہ میں تم سے عمر میں کافی بڑا ہوں۔ میں نے اپنی تمام جائداد تمہارے نام لکھ دی ہے اور اس جائداد پر میرا کوئی حق نہیں۔ لیکن میں نے تجھے نہ اپنایا ہوتا تو چند سال پہلے کی طرح تو آج بھی بمبئی کی سڑکوں پر پھرنے والی ایک عام اینگلو انڈین لڑکی ہوتی۔ تو بھول گئی کہ میں نے تجھے ذلّت کے گڑھے سے نکال کر آکاش کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ لیکن لیسلیوں کی فضاؤں میں پلا ہوا کہاں تک آکاش کی بلندیوں کو پا سکتا ہے ـ"

" نکی ــــ"

" چلاؤ مت لبنا ـــ جوانی نے تجھے اندھا کر دیا لیکن یہ مت بھول کہ اس جوانی میں رنگ میں نے بھرا ہے ـــ تو ایک ایسا سانہ ہے جس کا پردہ ٹوٹ چکا ہے۔ یہ ارغوانی جو تم پی رہی ہو، یہ شراب نہیں میرا خون ہے ـــ نکّی کا ـــ سیٹھ نیک رام کا ـــ اس کے ارمانوں کا ـــ حسرتوں کا۔ ۔ ۔ ۔ !؟"

" خاموش رہو نکّی ـ"

" نہیں اب میں خاموش نہیں ہو سکتا۔ لاوا پھٹ چکا ہے۔ آگ لگ چکی ہے۔

اور یہ آگ اب کبھی خاموش نہیں ہو سکتی۔ تم شاید یہ سمجھتی ہو کہ تم اِس آگ کی لپیٹ سے بچ نکلو گی، یہ تمہاری بھول ہے لُبنا ــــ جو تمہیں بنا سکتا ہے وُہ تمہیں بگاڑ بھی سکتا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تم دُوسری شادی نہیں کر سکتیں۔"

"دوسری شادی" حمید چیخ اُٹھا۔

"ہاں ــــ دُوسری شادی ــــ یہ عورت" یہ خوبصورت عورت میری بیوی ہے، بیوی ــــ اِس کے لئے مَیں نے گھر کو آگ لگا دی۔ بچّوں کو گھر سے بے گھر کر دیا ــــ میرا گھر ــــ میرے بچّے . . . . !"

حمید کو محسوس ہُوا کہ جیسے اُس کے پاؤں تلے کی زمین سرک رہی ہو۔ اس کا سر چکرایا۔ اُسے ہر چیز ناچتی نظر آئی۔ اُس نے لبنا کی طرف دیکھا اور اسے لگا جیسے لبنا کا حُسن جوانی، نیم عریاں بھرے بھرے بازُو، سب کچھ تکّی کی دولت کے زرخرید ہیں۔ جیسے لبنا کے گالوں کی لالی میں تکّی کے بچّوں کا خُون شامل ہو ــــ لبنا ــــ بیوی ــــ بچّے ــــ گھر ــــ اور ــــ اور ــــ کہکشاں ؟

وہ لڑکھڑاتا ہُوا دیواروں کے سہارے کمرے سے باہر دوڑا۔

کافی ٹھنڈ ہو چکی تھی۔ اور اُسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ ایک ایک واقعہ یاد آ رہا تھا ــــ ایک ایک منظر نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ لبنا تکّی کی بیوی ہے۔ تکّی نے اُسے زندگی بخشی، رعنائی دی، عزت عطا کی، لیکن پھر بھی وہ اس کی نہ بن سکی ــــ اور کہکشاں ــــ ؟ کہکشاں کو کیا ملا۔ دُکھ، درد، پریشانی اور دُوری ــــ مَیں نے اُس کی راتوں کی نیندیں چُرا لیں ــــ دن کا آرام لُوٹ لیا ــــ اُس کے صبر سے کھیلتا رہا ــــ اُس نے اُف

تک نہ کی ـــــ وہ اس سے اپنی پہلی محبّت سمجھ کر برداشت کرتی رہی ۔!

کہکشاں ـــــ !!

وُہ بھی توکسی کی بیوی ہے ـــــ !!!

حمید کاونٹر سے تقریباً دوڑتا ہُوا اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا ۔ جیب سے امریکن سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر سگریٹ سلگایا ۔

کار اب فرّاٹے بھرتی ہوئی بھاگ رہی تھی ـــــ !!!

●●

راج تلک روڈ جموں

۱۲ر فروری سنہ ۶۰ء

پیاری شنو !

حیرت ہے کہ تم میری بات کو نہ سمجھ سکیں میرا جملہ تو بالکل ہی سادہ سا تھا ۔ " زندگی انقلاب چاہتی ہے "۔ ایک لڑکی کی زندگی کا سب سے بڑا انقلاب شادی ہی تو ہوتا ہے ۔ تو شنو ! یہ انقلاب میری زندگی میں آ گیا ہے ۔ ہائے تم حیران ہو رہی ہو ۔ حیرانی کی کوئی وجہ نہیں ۔ کوئی آیا اور میرے دل کے ویران گھر میں بس گیا ۔ گھر آباد ہو گیا ۔ ایک خلا تھا جو پُر ہو گیا ۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی ۔ تم بتاؤ تم کیسی ہو ماں کیسی ہے ؟ چند دنوں کے لئے چلی آؤ نا یہاں ۔ اُن کو بھی دیکھ لو گی اِسی بہانے !

تمہاری —— واجدہ

گاندھی نگر ۔ جموں

۲ ۔ مئی ۷۶ء

اشفاق بھائی !

تُم خواہ مخواہ ناراض ہو گئے ۔ بخدا میں مجبور تھا ۔ سچ مانو تو یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ مجھے سوچنے کا موقع بھی نہ ملا ۔ ایک طرف اپنے بھائی جان کی رضامندی اور دُوسری طرف میری کشمکش ۔ مجھے راستہ دکھائی ہی نہ دیا ۔ اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تو اندھیرا ہی پایا ۔ روشنی کی کوئی کرن کہیں دکھائی نہ دی ۔ آخر میں نے لڑکی دیکھنے کا فیصلہ کر لیا ۔ پتلی پتلی سی، جھکی جھکی سی لڑکی شرماتی جب میرے سامنے آگئی، تو سچ مانو میں پہلی ہی نظر میں دل کھو بیٹھا ۔ آخر دل ہی تو ہے ۔ اور میں سوچنے لگا کہ میں یونہی اتنی دیر انتظار کرتا رہا ۔ ٹالتا رہا ۔ مجھے تو بہت پہلے بھائی جان کا کہنا مان لینا چاہیئے تھا ۔ جب میں نے ہاں کر دی تو سارے گھر میں خُوشی کی لہر دوڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی ۔ جس چیز کا خدشہ تمہیں اب ہو رہا ہے اُس کا مجھے نکاح سے پہلے ہی ہو گیا تھا ۔ مجھے احساس ہے کہ میں ایک متوسط طبقے کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں ۔ اگر معقول انداز میں سوچا جائے تو مجھے اُس بڑے گھر کی لڑکی سے شادی کی منظوری نہیں دینی چاہیئے تھی ۔ اُن کے کھانے پینے کا اپنا ڈھنگ ہے ۔ اُٹھنے بیٹھنے کا اپنا ڈھنگ ہے ۔ گھُومنے کے لئے کاریں ہیں ۔ رہنے کے لئے بہت بڑی حویلی ہے ۔ اور اپنے پاس کیا ہے ؟ ایک چھوٹا سا مکان اور اُس مکان میں بچّوں کی فوج ۔ نئی نئی نوکری ہے اور وہ بھی عارضی ۔ تم نے پُوچھا ہے کہ یہ رشتہ آخر ہو کیسے گیا ۔ تمہیں شاید میں نے لکھا تھا کہ پچھلی بار راستہ بند ہونے کی وجہ سے ہوائی جہاز کا سفر کرنا پڑا ۔ اُسی سفر کے دَوران واجدہ کی والدہ محترمہ سے مُلاقات

ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ محترمہ کو میری کون سی ادا بھا گئی۔ بس چل پڑی شادی کی بات۔ لڑکی کو تم نہیں جانتے کیا؟ بھئی واجدہ ہے، واجدہ! نکاح کے بعد ہم باقاعدہ ملتے رہے۔ پیاری سی لڑکی ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہے۔ اب چاہتا ہوں ۔۔۔۔۔ (جان من جلدی سے چلے آؤ۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں) پہلے پہلے تو سب کچھ اچھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ ہم اپنا الگ ایک مکان لے لیں۔ ایک چھوٹا سا، خوبصورت سا مکان! جس میں ہم دو رہ سکیں۔ میں اسے مذاق سمجھ کر ٹالتا رہا لیکن جب اس بات نے شدت اختیار کی تو میں گھبرا گیا۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنے بھائی بہنوں سے الگ نہیں رہ سکتا۔ میری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ میں نے صاف انکار کیا۔ اب سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں۔ بھائی جان بھی پریشان سے ہیں۔ ایک طرف یہ ضد اور دوسری طرف؟ کیا لکھوں اشفاق! کہ اس کے بغیر ایک لمحہ گذارنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب تو جی میں آتا ہے کہ خودکشی کر لوں۔

تمہارا اپنا ——— ایاز

(انگریزی سے ترجمہ)

رچمانڈ۔ امریکہ

۵ مئی ۱۹۶۰ء

پیارے ایاز

ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے میں جو لطف آتا ہے وہ قلمی دوستی میں کہاں؟ چار سال سے ہم ایک دوسرے کے قلمی دوست ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو لمبے لمبے خط لکھے۔ اپنی اپنی تصویریں بھیجیں لیکن کبھی رو برو بیٹھ کر ایک دوسرے سے بات

نہ کر سکے۔ ایک خط میں تم نے لکھا تھا۔ کاش! وہ لمحہ کبھی آ سکے۔ ہاں! اب وہ دن دور نہیں جب ہم مل سکیں گے۔ آج سے ٹھیک دس دن بعد ہم ہوائی جہاز سے بمبئی آ رہے ہیں۔ وہاں سے تمہارے ملک آنے کا بھی پروگرام ہے۔ تمہارا پتہ تو معلوم ہی ہے۔ ڈھونڈ نکالوں گی۔ تب تک کے لئے اجازت۔

نوٹ:۔ ذرا بتاؤ تو میں تمہارے لئے کیا لا رہی ہوں؟ میں جانتی ہوں تم نہ بتا سکو گے!

تمہاری دوست ۔۔۔ الزبتھ مور

۲ر جون ۔ (کشمیر ٹائمز کی ایک خبر)

آج رات کے آٹھ بجے کاسمو ہوٹل میں کشمیرین فرینڈشپ ایسوسی ایشن امریکہ کی مس الزبتھ مور کے اعزاز میں ایک دعوت دے رہی ہے۔ سارے ممبر اس میں شرکت کر رہے ہیں۔ مس مور قلمی دوستی کے ذریعے ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گی۔

گاندھی نگر۔ جموں

۹ر جون سنہ ۶۰ء

اشفاق بھائی!

تمہارا خط ملا۔ اِس لمحے تک تو حالات پہلے جیسے ہی ہیں۔ وہ اپنی بات پر بضد اور میں اپنی بات پر۔ وہ خاندان کی حویلی چھوڑ کر میرے نیم پختہ مکان میں آنا نہیں چاہتی۔ اور میں نیم پختہ مکان چھوڑ کر حویلی میں نہیں رہ سکتا۔ اپنا اپنا خیال ہے! اب تو میں نے واجدہ سے ملنا بھی ترک کر دیا ہے۔ (دل پہ پتھر رکھ کر) اللہ پھر فرصت

ہی کہاں ملتی ہے آج کل میں موجود ہے یہاں! اب تو تم آ ہی رہے ہو۔ خود دیکھ لو گے۔!

تمہارا ——— ایاز

جواہر نگر۔ سری نگر

۲۷ جون سنہ ۱۹۶۱ء

پیاری بہن!

خط لکھتے ہوئے شرم محسوس کر رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شروع کروں۔ اور کیا لکھوں۔ تم نے بغیر سوچے سمجھے واجدہ کا نکاح ایاز سے کر دیا۔ یہ دیکھے بغیر ہی کہ ایاز کیسا لڑکا ہے۔ نکاح کی شام ایاز کو دیکھ کر میں تمہارے حسنِ انتخاب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ کیا واقعی ایاز واجدہ کے قابل تھا؟ مختصر بات یہ ہے کہ ایاز ایک امریکن لڑکی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ چند روز تو میں یہ سب کچھ دیکھ کر خاموش رہا۔ لیکن جب ایک دن میرے ہی ایک ساتھی نے کہا۔ "کیا یہ وہی لڑکا ہے پروفیسر؟ جس کی شادی تمہاری بہن کی لڑکی سے ہوئی تھی؟" اب تم ہی کہو میں کیا جواب دیتا۔ کیسے کہتا یہ وہی لڑکا ہے۔ خدارا ایاز کو سمجھاؤ۔ خاندان کی عزت اور شرافت کو بچاؤ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایاز اس رشتے سے خوش نہیں۔ اب دو تین دن سے نظر نہیں آیا۔ شاید واپس چلا گیا ہے! واجدہ اور ہما کیسے ہیں؟

تمہارا بھائی ——— صادق علی

راج تلک روڈ جموں

۲؍ جولائی ۱۹۶۱ء

عزیزی ایاز !

آج دوبارہ تمہارے دفتر ٹیلیفون کیا، معلوم ہوا تم آج کل بہت کم دفتر جاتے ہو۔ ایک نہایت اہم معاملے پہ تم سے بات چیت کرنی تھی۔ تم جانتے ہو کہ ہمارا خاندان ایک ایسا خاندان ہے جس کی شرافت سارے کشمیر میں مشہور ہے۔ ہمارے خاندان کا تعلق ریاست کے سب سے بڑے خاندان سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے گھر میں معمولی سی بھی راہ روی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ تم ہمارے اپنے بچے ہو میرے خیال میں یہ سب کچھ تمہیں سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہاری بدنامی ہماری بدنامی ہے اور تمہاری عزت ہماری عزت! تم آج کل ہوٹلوں، کلبوں اور دوسری واہیات جگہوں پہ ایک انگریز لڑکی کے ساتھ نظر آتے ہو اور تم اسے لیکر سری نگر بھی گئے تھے۔ اُس لڑکی کے ساتھ ناچنے کی نازیبا حرکت بھی تم سے سرزد ہو گئی ہے۔ یہی کچھ ہوتا تو شاید میں یا میرے خاندان کی شرافت اور نیک نامی تمہیں معاف کر دیتی مگر اب سُنا ہے کہ تم اُس لڑکی سے شادی بھی کر رہے ہو!! اس سے آگے لکھنے سے قلم رُک رہا ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری بدنامی ہو رہی ہے بلکہ ہمارے خاندان کی شرافت بھی خاک میں مل رہی ہے۔ اگر حالات ایسے ہی رہے تو میں واجدہ کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کے لئے مجبور ہو جاؤں گی! میں اور کچھ نہیں لکھنا چاہتی۔ یہ خط تمہارے بھائی صاحب کی معرفت بھیج رہی ہوں کیونکہ تم آج کل دفتر بہت کم آتے جاتے ہو!!

بیگم ولایت حسین

۴- گاندھی نگر- جموں

۲ر جولائی ۱۹۶۰ء

محترمہ بیگم صاحبہ!

آج عزیزی ایاز کے نام آپ کا خط ملا - ایاز گھر پر نہ تھا - اس لئے میں نے خط کھول کر دیکھنے کی گستاخی کی - خط پڑھ کر مجھے بہت دُکھ ہوا - دُکھ اس لئے کہ ایاز بُری صحبت میں پڑ گیا ہے - اس کے لئے آپ مجھے یا میری تربیت کو قصور وار ٹھہرا سکتی ہیں - جہاں تک آپ کے خط کے آخری حصّے کا تعلق ہے، خدا را اتنی جلد بازی سے کام نہ لیجئے - میں ایاز کو سمجھا دوں گا -

تابعدار ——— محسن احمد

راج تلک روڈ - جموں

۱۱ر جولائی ۱۹۶۰ء

ایاز!

سناؤ کیا حال ہے؟ خیر تم اپنا کیا حال سناؤ گے - تمہیں آج کل فرصت ہی کہاں ملتی ہے اُس چڑیل سے! دن رات گھومتے رہتے ہو اُس کے ساتھ - جی میں آتا ہے اُس چڑیل کو سڑک پر پکڑ کر خوب پیٹوں - اُسے کیا حق ہے کہ ایک شریف عورت کے مرد کے ساتھ سرِ عام پھرے؟ رات بھر کلبوں اور ہوٹلوں میں ناچے - تمہاری قسم سچ کہتی ہوں میرا دل پھٹا جا رہا ہے - ہر روز نئی نئی خبریں سُن رہی ہوں - میری اِن سہیلیوں کو جیسے اور کوئی کام ہے ہی نہیں - دن بھر تمہارے اور اُس چڑیل کے بارے میں باتیں کرتی ہیں - آج ایاز "اشوکا" میں تھا "کوالٹی" میں تھا - امریکن لڑکی ساتھ تھی - ناچ رہے تھے - ایاز نے گلاب کا پھول پیش کیا -

لڑکی نے پھول کو اپنی آنکھوں سے چوما۔ میں یہ سُن سُن کر تنگ آگئی ہوں۔

میں نے اِس بارے میں بہت سوچا۔ اور اب اِس فیصلہ پہ پہنچی ہوں کہ مجھے تمہارے گھر فوراً آجانا چاہیئے۔ وہاں آکر تم میرے بغیر کچھ بھی نہ کر سکو گے۔ سُنو، اگر دو دن کے اندر اندر مجھے لینے نہ آؤ گے تو میں خُود ہی چلی آؤں گی! ہاں!!

تمہاری اپنی ——— واجدہ

۴۔ گاندھی نگر۔ جموں

۳۰ جولائی سنہ ۱۹۶۷ء

ڈیئر الزبتھ!

تمہارا خط ابھی ابھی ملا۔ تم ہمارے مُلک کی خوشگوار یاد اپنے ساتھ لئے واپس پہنچ ہی گئیں۔ شاید اب وہ دن دُور نہیں جب ہم لوگ بھی تمہارے مُلک آئیں گے۔ اب تو تم نے دعوت بھی دی ہے! ——— الزبتھ! تم جتنی خوبصورت ہو اُتنی ہی خوبصورتی سے تم اپنا کام بھی کر گئیں۔ یہاں آئی تو تھیں تم کشمیر دیکھنے لیکن میرے اللہ! یہاں تو تم رات رات بھر میرے ساتھ ناچتی رہیں۔ تمہارا طریقہ کامیاب رہا۔ میری بیوی خُود ہی چلی آئی۔ اب نہ مکان، نہ حویلی کا سوال ہے اور نہ کوئی اور سوال۔ قلمی دوستی ہمارے ممالک کے تعلقات کو اچھا بنائے یا نہ بنائے اُس نے میرے اور میری بیوی کے تعلقات کو اچھا بنا دیا۔ تمہاری سکیم کی داد دیتا ہوں۔

تمہارا دوست ——— ایاز

الکسا کی صورت دیکھ کر میری اور دیو کی آنکھیں پتھرا گئیں ــــ!
اُس کی آنکھوں میں پوری جھیل تھی ـــــ ایک خاموش ساکن جھیل۔
لانبے لانبے سُرخ بال ایسے لگ رہے تھے جیسے رات کے اندھیرے میں سونے کے تار چمک رہے ہوں۔ پتلے سے نازک ہونٹ ــــ جیسے گلاب کی پنکھڑیاں ہوں۔ اُس نے جب بات کرنے کے لئے مُنہ کھولا تو کانسے کے کٹورے سے ایسی آواز نکلی جیسے دُور کسی پہاڑ کی اُونچی چوٹی پر بنے ہوئے مندر کی گھنٹیاں اچانک بج اُٹھی ہوں ــــ!!
"میں نے اخبار میں آپ کا اشتہار دیکھا، میں اب بچّی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"
"مگر ــــ" دیو نے بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "آپ اور دایہ کا کام، دیکھئے ــــ"

"جی ہاں" وہ ہلکے سے بولی۔ "میری ایک ہی شرط ہے" بچی حسین ہو، خوبصورت ہو تو ...... ؟!"

"مگر" میں نے کہا۔ "یہ جگہ شہر سے بہت دور ہے، اور پھر یہاں ہمارے سوا کوئی نہیں رہتا، کسی اور کا مکان نہیں، صرف ہمارا ہی مکان ہے — ہمارے ہی کھیت ہیں۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر بول اُٹھی۔

"میں تنہائی پسند ہوں، مجھے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں، شاید یہی وجہ مجھے یہاں لے آئی — میں بچی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں اور دیبو اندر کمرے میں آ گئے جہاں ہماری دس ماہ کی بچی بنٹی سو رہی تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی۔ اُس نے بنٹی کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی اور بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔

"میں آپ کے ہاں نوکری کروں گی۔"

بوڑھے اندو نے اُس کا مختصر سا سامان اُوپر والے کمرے میں پہنچا دیا۔

بنٹی جلد سے الکا سے مانوس ہو گئی مگر الکا بنٹی کے سوا شاید ہی سارے گھر میں کسی اور سے مانوس ہوئی ہو۔ وہ ہمیشہ نوکروں سے دُور، مجھ سے اور دیبو سے دُور نہ جانے کیا سوچتی رہتی یا بنٹی سے کھیلتی رہتی۔ ایک رات ہم دیر تک الکا کے بارے میں سوچتے رہے، آخر وہ اتنی خاموش، اتنی اُداس اور اتنی غمگین کیوں رہتی ہے۔ بنٹی کے علاوہ وہ ہر ایک سے دُور دُور کیوں رہتی ہے۔ اُس کے دِل میں کیا دُکھ ہے۔ اُسے کون سا روگ ہے — اچانک رات کی تاریکی

میں ایک میٹھی، سُریلی سی آواز اُبھری، کوئی وائلن بجا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے، ہلکے ہلکے ایک میٹھا سا درد بھرا راگ اُبھر رہا تھا ـــــ دیو نے اُٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا، مجھے اشارہ کیا، میں دیو کے قریب آئی۔ وائلن کی آواز الکا کے کمرے سے آرہی تھی۔ ہم دونوں بے ساختہ اُس کے کمرے کی طرف جانے لگے۔

الکا کے کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ اُس نے ہلکے سبز رنگ کا نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ کمرے میں رکھی ہوئی کرسیوں میں دھنس گئے۔ وہ کافی دیر تک وائلن بجاتی رہی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ وائلن کی آواز میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ ہم دونوں کو محسوس ہوا جیسے ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گونگے ہو گئے ہوں۔ اچانک اُس نے وائلن بجانا بند کر دیا اور اُسے فرش پر پھینک دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی۔

"الکا" میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ ایسے چونک پڑی جیسے سپنے میں اُسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔

"کون ہے؟" اُس کی نیلی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی۔ مجھے اور دیو کو دیکھ کر وہ کچھ لمحے خاموش رہی، کچھ سوچتی رہی۔ اور پھر بولی۔

"میں اِس وقت سونا چاہتی ہوں۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید مجھے یا دیو کو ایک نوکر کے یہ الفاظ بُرے بھی محسوس ہوتے مگر اس وقت اُسے عجیب سی حالت میں دیکھ کر ہم خاموشی سے اُٹھ آئے ـــــ ساری رات الکا ہمارا موضوع رہی ـــــ!!

صبح سویرے جب دیوا اپنے کھیتوں میں چلا گیا تو الکا میرے کمرے میں آ گئی
اس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ ساری رات روئی ہو۔
"مجھے کل کے رویئے پر افسوس ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں"۔ اُس کی آواز
بالکل سپاٹ اور سیدھی تھی۔

"بیٹھو"۔ میں نے کہا۔ وہ بیٹھ گئی۔

"الکا میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں کون سا روگ اندر ہی اندر کھائے
جائے رہا ہے۔ ورنہ تم جیسی حسین لڑکی کے لئے ایسی حالت کچھ عجیب سی
لگتی ہے۔ تم جوان ہو، خوبصورت ہو ___ اتنی خوبصورت کہ میں نے اپنی ساری
زندگی میں تم سے خوبصورت لڑکی شاید ہی دیکھی ہو۔ تمہارے لئے دایہ کا یہ پیشہ
بھی عجیب سا لگ رہا ہے ___ مجھے بتاؤ تمہیں کیا دکھ ہے۔ کیا روگ ہے۔
___ بتاؤ الکا، ایک عورت سمجھ کر، ایک بہن سمجھ کر۔۔۔۔"

الکا خاموش رہی۔

"تم شادی شدہ ہو؟" میں نے پھر بات چھیڑی۔

"شادی"۔ وہ چونک پڑی۔ "مجھے مردوں سے نفرت ہے"۔

"نفرت؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ "یہ لفظ میرے لئے نیا ہے۔ اور
پھر میں نے نفرت اور محبت کے بارے میں تم سے کچھ بھی تو نہیں پوچھا۔ میں نے
صرف اتنی سی بات پوچھی تھی کہ تم شادی شدہ ہو۔۔۔!"

"نہیں"۔ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"تمہارے گھر میں کوئی اور بھی دایہ کا کام کرتا ہے"؟ اس سوال پر وہ گھبرا گئی۔

"دیکھئے بنٹی سے مجھے بیحد پیار ہے۔ مَیں اُس کی دیکھ بھال کرتی ہوں خُدارا مجھے اُس سے جُدا نہ کیجئے۔ مَیں مانتی ہوں کہ میرے خاندان میں کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے —— پھر بھی ۰۰۰۰۰!"

"بہن الکا —" میں نے کہا "تم میرا مطلب غلط سمجھ رہی ہو۔ بنٹی اب تم سے کافی مانوس ہو گئی ہے، اُس کو تمہاری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی تم کو اُسکی"۔

اتنے میں بنٹی کے رونے کی آواز آئی اور الکا چلی گئی۔ الکا جتنی دیر ہمارے ہاں رہی اُس نے بنٹی کے علاوہ کسی بھی چیز میں دلچسپی نہ لی۔ دیو کے سامنے وہ آتی ہی نہ تھی۔ شاید اُس کے لئے دیو بھی اُن مردوں میں شامل تھا جن سے وہ نفرت کرتی تھی۔ نفرت کی اِس وجہ کو سمجھنے کی ہم نے جتنی کوشش کی ہم اتنے ہی ناکام ہو گئے۔

الکا کو ہمارے ہاں کام کرتے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا لیکن اُس نے اپنی تنخواہ لینے سے انکار کیا۔ میں نے زبردستی اس کے ہاتھوں میں پیسے تھما دیئے۔ دوسرے دن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اُس نے اپنی ساری تنخواہ سے بنٹی کے لئے کھلونے خرید لئے ہیں۔ بنٹی اور الکا کی آپس کی محبت دیکھ کر ہم الکا کے اَن دیکھے دُکھ کو بھُول گئے۔ اُسے ہر لمحہ اُداس، خاموش دیکھ کر میں بالکل مانوس سی ہو گئی۔ جیسے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔ اور پھر جب بھی میں نے الکا سے بات کرنے کی کوشش کی، وہ ہمیشہ ٹال گئی۔ دیو نے تو بالکل ہی خاموشی اختیار کی تھی ——!!

پھر ایک رات ایک عجیب سی ان ہونی بات ہو گئی۔ دیو اور میں رات گئے تک باتیں کرتے کرتے سو گئے تھے کہ اچانک الکا کے کمرے سے بنٹی کے

رونے کی آواز آئی۔ میں کچھ دیر خاموش رہی کہ شاید الکا چُپ کرانے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر کچھ بھی نہ ہُوا۔ الکا کی آواز سُنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ جب بنٹی نے چلّانے کی حد تک رونا شروع کیا تو دیو کی آنکھ بھی کُھل گئی۔ وہ جلدی سے الکا کے کمرے کی طرف بھاگا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگتی رہی۔ ہم دونوں یکلدم الکا کے کمرے میں گھُس گئے۔ میں نے جلدی سے بنٹی کو گود میں اُٹھا لیا۔ اُسے گود میں اُٹھانے کی دیر تھی کہ وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں الکا فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کا وائلن ایک طرف پڑا تھا۔ وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے۔

"کیا بات ہے الکا؟" دیو نے جلدی سے پُوچھا۔

اُس نے آہستہ سے آنکھوں کے دیدے گھما دیئے اور اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے اللہ ـــ" اُس کے دونوں ہاتھ بے حس ہو گئے تھے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دیو ایک ہی جگہ ساکن ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اتنی حسین، خوبصورت اور جوان لڑکی کے ہاتھ بے حس ہو سکتے ہیں۔ یہ تو ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

اچانک دیو نے کہا ـــ "میں ڈاکٹر دُرانی کو لے آتا ہوں شہر سے۔ مجھے کچھ دیر تو لگ ہی جائے گی، تب تک تم الکا کو بستر پر لٹا دو اور اُس کے جسم میں گرمی پہنچانے کی کوشش کرو۔"

وہ لمحات میری زندگی کے سب سے کربناک لمحے تھے۔ الکا رو رہی تھی۔

بنٹی سو رہی تھی اور میں پاگلوں کی طرح کمرے میں گھوم رہی تھی۔

دفعتاً الکا بول اٹھی —— "اچھا ہی ہوا میرے یہ دونوں ہاتھ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے۔ یہ اسی قابل تھے۔ اچھا ہی ہوا۔۔۔۔۔!"

"الکا —— الکا —— ہوش میں آؤ، کیا بات ہے الکا ——"

"آپ نہیں جانتیں —— کوئی نہیں جانتا —— یہ دونوں ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں نا —— ان دونوں ہاتھوں نے ایک بچے کا خون کیا تھا نا۔۔۔۔۔!!"

میں گھبرا گئی —— !!!

نہ جانے الکا یہ کیسی باتیں کر رہی تھی۔

دیو ڈاکٹر درّانی کو لے کر آ گیا۔ وہ کافی دیر تک الکا کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے کہنے پر اُسی رات ہم نے الکا کو ڈاکٹر درّانی کے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کر دیا۔ جب میں نے دیو سے یہ کہا کہ الکا نے ایک بچے کا خون کیا ہے۔ تو وہ ہنس کر کہنے لگا۔

"الکا اور خون —— میرا خیال ہے کہ اُس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔"

الکا کو دیکھنے ہم تقریباً روز ہی جاتے۔ کیونکہ بنٹی دن بھر روتی رہتی۔ الکا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ وہ اس کے چہرے کی طرف تکتی رہتی۔ ایک دن ڈاکٹر درّانی نے کہا۔

"الکا کو کوئی زبردست صدمہ پہنچا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کچھ معلوم کر سکوں لیکن وہ خاموش ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو وہ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جائیگی۔"

ڈرانی دیو کا بہت گہرا دوست تھا۔ اِس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ الکا کی عجیب سی بات سے اُسے مطلع کیا جائے۔ جب ڈرانی نے خون کے بارے میں سُنا تو اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔

"یہاں آج کل ایک جرمن ماہر نفسیات آیا ہوا ہے۔ اس کے لئے یہ کیس اچھا رہے گا۔"

چند دنوں کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ماہر نفسیات اِس میں پوری دلچسپی لے رہا ہے اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ اور پھر ایک دن ڈاکٹر ڈرانی پوری کہانی لے کر چلا آیا۔

"الکا ایک متوسط کرسچین گھرانے میں پیدا ہوئی۔ یہ ماں باپ کی سب سے بڑی اور سب سے حسین بیٹی ہے۔ اُس کی دو اور بہنیں ہیں۔ ایک اُس سے دس سال چھوٹی یعنی چودہ سال کی، اور دُوسری دس سال کی۔ ماں تپ دق کی مریضہ ہے۔ باپ کو شراب کی لت ہے۔ اِس لئے اُس نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ الکا بڑی بیٹی تھی، جوان تھی۔ اِس لئے ماں کے زیادہ قریب تھی۔ اِس کی ماں کو بھی اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اگر الکا اُن سب کا خیال نہ رکھے، اُن سب کے لئے کام نہ کرے تو وہ سب کسی بھی دن بھوک اور فاقوں سے مر سکتے ہیں۔ اُن سب کو زندہ رکھنے کے لئے، اپنے آوارہ باپ کو شراب کے لئے پیسے مہیا کرنے کے لئے، اپنی بیمار ماں کو دوا لانے کے لئے، اپنی چھوٹی بہن کی عریانیت چھپانے کے لئے الکا کو دن رات کام کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ کسی کے کپڑے سیتی، کسی کے برتن صاف کرتی ـــ وہ ہر حال میں اپنی ماں کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ اور ماں الکا سے اسی لئے زیادہ پیار کرتی تھی۔ یہی ایک

پیار تھا جو اُسے زندہ رہنے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ اچانک الکا کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہُوا۔ اُس کی ایک اور بہن پیدا ہو گئی۔ جس کی صُورت بالکل الکا سے ملتی جُلتی تھی ــــ ویسے ہی سُنہری بال، ویسی ہی گہری نیلی آنکھیں۔ ماں کی شفقت جو اب تک الکا کے لئے محفُوظ تھی، جس شفقت کے سہارے وہ جی رہی تھی، وہ اب نوزائیدہ بہن کے حصّے میں آ گئی۔ اب گھر میں کوئی بھی اُسے پیار نہیں کرتا تھا۔ کوئی بھی پیار سے نہیں پُکارتا تھا۔ بلکہ اُسے پیار کے بدلے گالیاں ملتی تھیں۔ اگر وہ وقت پر باپ کو شراب کے لئے پیسے نہ لا سکتی تو وہ الکا کو خوُب مارتا۔ اگر ماں کو وقت پر دوا نہ ملتی تو وہ اُسے گالیاں دیتی۔ بہنوں کو وقت پر کھانا نہ ملتا تو وہ رُوٹھ جاتیں ــــ الکا کو سارے گھر سے نفرت ہو گئی اور ایک دن وہ وہاں سے بھاگ نکلی!

"اور یہاں آ گئی ــــ" دیو نے پُوچھا۔

"نہیں، وہ ایک حسین بچّی کی دایہ بن گئی ــــ اور ؟"

"اور کیا ؟ ــــ" میں نے جلدی سے کہا۔

"کچھ دن وہاں کام کرنے کے بعد اچانک وہ بچّی مر گئی۔ گھُٹن کی وجہ سے ــــ اور الکا وہاں سے یہاں چلی آئی ــ"

"لیکن اِس میں الکا کا کیا قصُور ؟"

"الکا کا کہنا ہے کہ جب وہ اس بچّی کو دیکھتی تو اُسے اپنی نوزائیدہ بہن یاد آ جاتی جس نے اُسے نفرت سے آشنا کرایا تھا۔ وہ جس قدر اُسے چھُو لینے کی کوشش کرتی وہ اُسی قدر یاد آ جاتی، اور پھر ایک دن، ایک جنُونی لمحے میں وہ پاگل سی ہو گئی۔ اور اُس نے بچّی کو گھٹن سے مار دیا۔"

میرے منہ سے اچانک ایک بھیانک چیخ نکل گئی "میرے اللہ تو کیا وہ ایک دن بنٹی کو بھی مار دے گی" میں نے بنٹی کو سینے سے لگالیا۔

"پھر اس کا یہاں ملازم ہو گئی" درانی ڈاکٹر کہہ رہا تھا "اُسے اپنی کمزوریوں کا علم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کسی خاص جنونی لمحے میں وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ بنٹی کی خوبصورت آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر سکتی تھی۔ یہی خیال اُسے کھائے جا رہا تھا۔ وہ بنٹی کو حد سے زیادہ چاہنے لگی تھی۔ ایک طرف محبت تھی اور دوسری طرف خوف ۔ پھر اس رات اچانک اُس پر جنون سوار ہو گیا۔ اُس نے وائلن بجانا چاہا۔ اپنے جنون کو وائلن کی آواز میں گم کر دینا چاہا لیکن وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے۔ بنٹی سامنے سو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خونی چمک آگئی اور اُس کے ہاتھ بنٹی کے گلے کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ وہی کرنے جا رہی تھی جس کام سے ڈرتی تھا۔ اچانک اُس کے ہاتھ ساکن ہو گئے۔ اُس کے ہاتھ بے حس ہو گئے۔ اُس کے دل نے پہلی بار اُس کے دماغ کو قابو میں کر لیا۔"

ڈاکٹر درانی خاموش ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بنٹی میری گود میں خاموش، ہم لوگوں کو گھور رہی تھی۔

"ڈاکٹر اب اس کا کیا ہو گا؟"

"اُس کی حالت خراب ہے۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کسی پاگل خانے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"!

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ کمرے میں ایک غیر یقینی سی خاموشی چھا گئی۔

(مرکزی خیال انگریزی سے)

●● ———

اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے جھیل ڈل کی گہرائیوں میں کھلے ہوئے دو کنول ہوں۔ اُس کے چہرے کی شہابی رنگت کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے بادام واری کے سارے شگوفوں کا رنگ بکھر چلا ہو اور وہ ہونٹ اور اُن پر تھرکتی ہوئی مُسکراہٹ؛ ایسا لگتا تھا جیسے شیش ناگ کی سیمیں سطح پر صُبح کی پہلی کرن آن پھیلی ہو۔ جھیل کی یخ ٹھنڈی لہروں میں تیراکی کا لباس پہنے اپنے جسم کو تھرکا رہی تھی۔ اُس کی ٹانگوں میں معمولی سی حرکت ہوتی، جسم ایک ہلکا سا بل کھاتا اور وہ لہراتی ہوئی ایک خاموش پرندے کی طرح پانی میں چھلانگ لگاتی۔ پانی کی لہریں جسم کے ہر حصّے کو چُومتیں۔ لوگ تالیاں بجاتے اور ساتھ ہی پانی کی اِس غیر شائستہ حرکت سے جل اُٹھتے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا سر پانی سے اُبھرتا۔ اُس کے نازک نازک پتلے پتلے سے ہونٹ آہستہ سے کھلتے اور وہ پُراسرار طور مُسکرا دیتی۔ ویسے ہی جیسے مُرغابی کبھی کبھار یُوں

ہی اپنی نازک سی گردن کو ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر پھڑپھڑاتی ہے ــ!

جوں ہی وہ پانی میں کودتی، ہر ایک پانی میں چھلانگ لگاتا۔ لڑکی جب یہ دیکھتی کہ سارا ہجوم اُس کے پیچھے چلا آرہا ہے تو وہ خاموشی سے ناؤ پر چلی آتی۔ میں بُت بنا دیکھ رہا تھا۔ صرف اِس لئے کہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ ہاں ٹیوب لیکر کبھی کبھار پانی میں اُتر بھی جاتا ہوں مگر اس افراتفری میں میرا کیا کام ــ؟ ہر ایک اپنے اپنے کھیل کا مظاہرہ کر کے دلچسپی لینے پر مجبور کر رہا تھا اور میں تھا کہ کوئی دیکھ ہی نہ رہا تھا ــــ لمبی لمبی مسواک جیسی ٹانگیں، باہر کو نکلی ہوئی موٹی توند، اور پھر ان سب سے بڑھ کر میرا عجیب سا سر۔ ظاہر ہے کہ مجھ میں دلچسپی لیتا کون؟ میرا حال تو چڑیا گھر میں رکھے ہوئے اُس مریل بندر کا سا تھا جس پہ لوگ ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہیں اور مُسکرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں کبھی کبھی بے ڈول انسان میں بھی یہ خواہش جاگتی ہے کہ اُسے دیکھ کر کوئی مُسکرا اُٹھے، مُسکرا کر اُس کے مُنہ پہ تھپڑ مار دے، اور کہہ دے ــــ "او مریل سے بندر تم کس لئے زندہ ہو" میرے دل میں بھی ایسی ہی خواہش جاگی، لیکن من کی من ہی میں رہی کسی نے میری تمنّا کو نہیں کریدا ــ!

میرا دل ناؤ پر سوچتے سوچتے بھر آیا۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ آخر سمندر اور ریت کے کنارے پہ میں یہاں چلا ہی کیوں آیا۔ نہانا ہی تھا تو میں اپنے گھر کے اُس بند غُسل خانے میں بھی نہا سکتا تھا، جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اُس غُسل خانے میں میں نے اپنے جسم کو گھور گھور کر دیکھا ہے۔ ہر ایک رگ کو پہچانا ہے ــــ اُسی غُسل خانے میں مجھے پہلی بار اپنی بدصورتی کا احساس ہوا۔ اور مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

میں واپس جانے کے لئے مڑا۔ تیراکی کے لباس میں اپنا مضحکہ اڑانے سے تو یہ بہتر تھا کہ کپڑے پہن کر اپنی بدصورتی کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپا لوں۔ دوسروں کی نظروں سے چھپتے ہوئے میں کمرے کی طرف مڑا۔

"مسٹر — !" کانسی کے کٹورے سے آواز سنائی — میرے سامنے بھورے بالوں والی لڑکی کھڑی تھی۔ مگر کیوں ؟ میں حیران سا رہ گیا۔

"آپ بنا نہائے ہی واپس جا رہے ہیں ؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بس جا رہا ہوں !" مجھ سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا۔ میں گھبرا سا گیا۔ اور میری آنکھیں بھر آئیں۔

"او — مگر کیوں ؟"

"مجھے تیرنا نہیں آتا — !"

اس نے اپنے اعضا کو تھرکایا۔ جیسے مرغابی اپنے پر پھڑپھڑاتی ہے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں صبح کا اجالا پن اور شفق کا زرّیں سونا پگھل رہا تھا۔

"میں آپ کو تیرنا سکھاؤں گی —" اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا۔ مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر کسی رقص میں ڈھلتا محسوس ہوا۔ میرے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں۔

"مگر — !" میں نے کچھ کہنا چاہا۔ میرے ہونٹ کسی بوسیدہ قلعے کے دروازے کی طرح بند رہے۔ مدھوں آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ سمندر قریب آیا۔

"آج تک ڈوبتے آئے ہو۔ آج کسی کے سہارے تیر کر بھی دیکھ لو — !"

"مجھ سے نہیں ہوتا — !"

"ٹھہرو —" یہ کہہ کر اُس نے پانی میں چھلانگ لگائی۔ ٹیوب کے سہارے میں پانی میں بالکل کھڑا ہو گیا۔ اُس کا ہاتھ میرے کمر کے گرد آ لگا۔ اُس نے مجھے پانی میں لیٹا دیا اور مجھے تیرنا سکھانے لگی۔ جب وہ ٹانگیں ہلانے کو کہتی تو میرے ہاتھ چل پڑتے۔ جب ہاتھوں کو حرکت میں لانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو خود بخود میری ٹانگیں چلنے لگتیں۔ بے ساختہ اُس نے ایک ہاتھ میرے کمر پہ رسید کیا۔ کاش میں عمر بھر تیرنا نہیں سیکھ سکتا۔ اور ایسے ہی نرم و نازک ہاتھوں سے میرے بدصورت جسم کی تواضع ہوتی! کتنا پیار تھا اُس کے مارنے میں! کتنا اُنس تھا اُس کے سکھانے میں! میں بے خبری میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہا!

مجھے زندگی کا سب سے انوکھا پیار مل رہا تھا۔ عورت کا پیار، محبوبہ کا پیار — انوکھا — پُر کیف — خواب آور — اب میری راتیں بے خواب نہیں گزریں گی۔ کاش زندگی میں یہی سب کچھ ہوتا۔ دُنیا ڈل کی اِس خوبصورت جھیل میں سما سکتی۔ آج تک میں کہاں سو رہا تھا۔ زندگی اتنی پُر کیف اور خوبصورت ہو سکتی ہے، کاش اس کا اندازہ مجھے پہلے ہوا ہوتا —!

"ہاں — ہاں، اب ٹھیک ہے، بالکل ایسے۔" اُس نے کہا۔

تھوڑی دیر سستانے کے لئے ہم ناؤ پہ چلے آئے۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ اُس کا نام ایسا ہے۔ وہ ہنگرین ہے۔ وہ یہاں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ آئی ہے۔ چند سال پہلے بھی یہاں آئی تھی۔ اُسے

میں نے مہندر کی عقابی آنکھوں میں جھانکا۔ جھیل سے بھی گہری اور ٹھنڈی تھیں۔ من ہی من میں سوچا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت نہیں ہونی چاہئے۔ اگر ایک حسین سی ایک نازک سی لڑکی مجھ میں دلچسپی لے سکتی ہے تو میں اپنے آپ سے نفرت کیوں کروں۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ میرا دل بھی تو تشنہ ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ پیار کے نام پر کسی کی حسین سوچیں میری ملکیت ہوں۔ روح کے حسن کے لئے پیار کی کیف آور سوچیں لازمی ہیں۔ میں بدصورت سہی، مگر میری سوچیں بھی کہیں ٹھہری ہوئی ہیں کیسی آن جانے اجنبی مدوجزر کی پہنائیوں میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ ایک دن لپک کر میرا ہاتھ تھام لیں گی۔ شاید یہی لڑکی میری منزل ہو۔ اب تو میری منزل میرے قریب ہے، بالکل قریب۔ محبت خوبصورت لوگوں کی جاگیر تو نہیں، اور پھر اگر میری قسمت میں ایک بھورے بالوں والی لڑکی سے ملاپ لکھا تھا تو اس میں میرا کیا دوش! میرے خوبصورت ساتھی اپنا سر پیٹیں تو پیٹا کریں۔ میں نے مہندر کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا ——— میں نے دبی زبان میں کہا۔
"کچھ بھی ہو آج مجھے تیرنا ہی ہو گا"
میں نے اپنا سر اونچا کیا اور لڑکی کے ساتھ چل پڑا۔ اُس نے ٹیوب میرے گلے میں لٹکا دیا اور مسکراتے ہوئے پانی میں دھکیل دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے پانی میں میرا دم گھٹ رہا ہو اور جھیل کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ پانی میرے سر سے اُوپر جانے لگا اور پھر میں خود بخود سطح پر اُبھر آیا۔ ٹیوب کو زور سے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا رہی تھی۔ میں اب تیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تیرنے کا بہت زیادہ شوق ہے ۔ دفعتاً اُس نے مجھ سے پُوچھا ۔

"ذرا سُننا وہ لڑکی اپنے ساتھی سے کیا کہہ رہی ہے ؟" اُس نے سامنے بیٹھے ہوئے ایک جوڑے کی طرف اشارہ کیا ۔

"او ۔۔۔ وہ تو میرا دوست ہے پُورن ۔ اُس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے ۔ وہ اپنی بیوی کو نہانے کے لئے مجبُور کر رہا ہے ۔ مگر وہ شرما رہی ہے ۔"

"عجیب سی بات ہے، آخر اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے ؟"

"اتنے لوگ جو ہیں یہاں ۔" میں نے کہا ۔

"وہ حُسن ہی کیا جو مردوں سے چھُپایا جائے ۔" تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی !

"مجھے یہاں کے لوگ بالکل پسند نہیں ۔"

"کیوں ۔۔۔ ؟" میں نے پُوچھا ۔

"ارے یہاں کے مرد ہیں کہ اپنے جسم کی نمائش کرتے ہیں اور عورتیں ہیں کہ کپڑوں میں لدی ہوئی ہیں ۔۔۔ !"

"یہ تو اپنی اپنی تہذیب ہے ۔ مرد کماتے ہیں، محنت کرتے ہیں ۔ عورتوں کی اپنی دُنیا ہے، اپنی تہذیب ہے ۔ یہاں کی عورتیں اپنے خاوندوں کے اشاروں پہ چلتی ہیں ۔ غیروں کی طرف دیکھنا گناہ سمجھتی ہیں ۔ آپ کے ہاں کی عورتیں حُسن کی نمائش کرتی ہیں ۔ دوست بناتی ہیں ۔۔!"

"مگر میرا خیال ہے کہ ہر خوبصورت چیز کی نمائش ہونی چاہئے ۔" اُس نے میری بات کاٹ کر کہا ۔

"گویا وہ عورتیں نہ ہوں۔ نمائش میں سجی ہوئی گڑیاں ہوں ۔۔۔۔۔ شوکارے میں رکھے ہوئے رنگ برنگے پھول ہوں ۔۔۔۔۔!"

"یو۔۔۔ ناٹی بوائے۔۔۔" وہ مسکرا دی۔ اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر ایسا لگا جیسے پہلی کا چاند نکل آیا ہو۔

"آپ کی شادی ہو گئی ہے کیا۔۔۔؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"شادی۔۔۔ شادی۔۔۔" وہ کچھ سوچنے لگی۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا۔۔۔ "ابھی نہیں۔ میں اِس لمحے تک کسی کو منتخب ہی نہ کر سکی۔۔۔ البتہ کسی کے ساتھ بات چلی تھی۔ میں نے انکار کیا۔۔۔" اُس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ وہ میرے شادی شدہ دوست سے زیادہ خوبصورت اور دولتمند نہ تھا۔"

اب کی بار میں زور سے ہنس پڑا۔ اُس نے مجھے پانی میں دھکیل دیا۔ اور خود ہنسنے لگی۔ میں پانی میں جھولتا رہا۔ میرے دوست واٹر سکیٹنگ کا مزہ لے رہے تھے۔ اور میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیسے موٹر لانچ میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں ڈگمگا یا۔ پانی کی لہروں نے مجھے اُونچا اُچھال دیا۔ میں نے چیخنا چاہا، مگر میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ بے ساختہ مجھے اپنی بدصورتی یاد آگئی اور میں احساسِ کمتری کا شکار بن کر رہ گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی مگر فضول! واٹر ٹیوب میرے ہاتھ سے نکل کر دُور کہیں پانی کی سطح پر تیرتا چلا گیا۔

"پدران ۔" مجھے الیسا کی آواز سُنائی دی ۔ میں نے جواب دینے کی کوشش کی مگر دے نہ سکا ۔ آہستہ آہستہ میں جھیل کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا ۔ ایک نرم و نازک ہاتھ میرے کمر کے گرد آ لگا ۔ یہ ہاتھ الیسا کے سوا کسی کا نہ تھا ۔ اُس کا خوبصورت ہاتھ کانپ رہا تھا ۔ اُس نے مجھے زور سے پکڑا ۔ اُس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی ۔ بے خیالی کے عالم میں میں سہلا اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے میرا ہاتھ اُس کی کمر کے گرد حلق ہوگیا ۔ میں نے بھی موت کے ڈر سے اپنی گرفت مضبوط کر لی !

آہستہ آہستہ ہم ناؤ کی طرف آ گئے ۔

وہ مُسکرا دی ۔

اُس کے گداز جسم میں تھرتھراہٹ سی تھی ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے الیسا میرے جسم جسم کی ساتھی ہو ۔ میں پھر اپنی بدصورتی کو بھول گیا ۔ آج مجھے ڈل جھیل بہت ہی خوبصورت دکھائی دی ۔ حالانکہ میں کئی بار اپنی بدصورتی کو دیکھ کر یہاں آیا تھا ۔ ہر بار یہ جھیل مجھے اپنے جسم کی طرح بدصورت نظر آتی تھی ـــــ نہ جانے کیوں ـــــ ؟

میں کھوتا گیا ۔ اچانک میری گرفت ڈھیلی ہوگئی ۔ میں کسی اور ہی دُنیا میں پہنچ گیا تھا ۔ اُس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور عجیب سے انداز میں مُسکرائی ۔

ہم ناؤ پہ چلے آئے ۔

میں نے اپنے بدصورت جسم کو تولئے سے ڈھانپتے ہوئے کہا : "شکریہ ۔"

"کس بات کا؟"

"آپ نے ڈوبنے والے کو تیرنا سکھایا۔"

وہ خاموش رہی۔ میری بدصورتی میں کسی کا نقش ڈھونڈتی رہی۔ پھر اس نے مرغابی کی طرح اپنا جسم سکیڑا۔ اور دوبارہ جھیل میں چھلانگ لگانے کی تیاری کرنے لگی۔

وہ بھی تیرنا نہیں جانتا تھا۔ میں نے اُسے تیرنا سکھا دیا اور پھر ایک دن ایسی ہی جھیل میں ڈوبنے دیا ــــ وہ ڈوب گیا۔ جھیل کی تہہ میں سو گیا لیکن تم ․․․․․ نہ جانے کیوں مَیں نے تمہیں ڈوبنے سے بچا لیا۔ نہ جانے کیوں؟

مجھ پہ لرزہ طاری ہو گیا۔!

"تم نے اُسے ڈوبنے دیا؟"

"کیونکہ وہ بدصورت تھا۔" اُس نے اُسی لہجہ میں جواب دیا۔

"مَیں بھی تو بدصورت ہوں۔ مجھے کیوں بچایا؟"

"وہ میرا شوہر تھا۔ تم میرے کچھ بھی نہیں۔ اُس نے مجھے ہمیشہ کے لئے خرید رکھا تھا۔ اِس عمر میں جب مَیں صرف تیرہ سال کی تھی اور وہ تیس برس کا۔ بدصورتی قابلِ برداشت ہے لیکن عمر کا فرق، خیالات کا فرق ــــ اور تم کتنے بدصورت ہو، کتنے کم عمر ہو۔ کاش کہ تم میں میرے شوہر کی پرچھائیں نہ ہوتیں۔ کاش کہ تم ․․․․․!"

مرغابی جھیل میں کود گئی۔ تیرنے دائیں بائیں کسی کو ڈھونڈتی رہی۔ اب اُس میں دلچسپی لینے والا کوئی نہ تھا۔ اب اُس کے سیمابی جسم کو تاکنے والا کوئی نہ تھا

اُسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ تن تنہا دُور تک بہتی چلی گئی۔ نہ جانے کس کنارے لگی! ہو سکتا ہے کہ اُسے کسی کنارے کی نہیں، کسی محبوبہ کی تلاش ہو۔ ہو سکتا ہے —— ! وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی، اور میں نہانے کے لباس میں بُت بنا کھڑا رہا۔ شام بھی ڈھل گئی، رات بھی اُتر آئی۔ میری نگاہیں اُس بدصورت انسان کے جسم کو ڈھونڈتی رہیں جو ایسی ہی جھیل کی تہہ میں چھپا بیٹھا شاید مجھے ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کرتا رہا —— شاید اپنا کو محبوبہ سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا رہا —— حالانکہ بدصورت لوگ کتنے معصوم ہوتے ہیں — !

میری نگاہیں دُور مشرقی پہاڑوں کی ساکن وسعتوں میں کھونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ڈوبتے سُورج کی زرد چمکیلی کرنیں مشرقی پہاڑوں کی سفید چوٹیوں کو چھُو رہی ہیں۔ وُہ اُن سے ایسے لپٹ رہی ہیں جیسے یہ اُن کا آخری لپٹنا ہو۔ اُنہیں یقین ہو کہ اب وہ جھلمل کرتے برف کے اِن سفید رو پہلے ذرّوں سے پھر نہیں مل سکیں گی۔

اور ایسے میں .....

میرا دِل ڈُوب رہا ہے۔

رونا چاہتا ہے۔

شاید اُس صُبح کی تلاش میں جو ویران ہوگئی، اُس رات کے لئے جو کھوگئی۔ اُس دن کے لئے جو محبّت کا گیت گاتا زندگی کی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ، خاموش خاموش۔ دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے

گم ہو گیا . . . .

اُف میرا دِل کتنا اُداس ہے۔

کتنا ویران ۔

کتنا اُجاڑ ۔

میں کیوں خاموش خیالوں میں ڈوبی ہوئی ہوں ۔ میری آنکھوں میں یہ کیسے آنسو ہیں جنہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا ۔ یہ کیسا درد ہے ۔ اِس درد میں اِتنی کسک کیوں ہے ۔ اتنی چبھن کیوں ہے ۔ یہ کیسی آگ لگ گئی ہے ۔ کیا اب کوئی بادل نہ برسے گا ۔ آنسوؤں کا یہ کیسا سیلاب اُمڈ رہا ہے ۔ کیا ان آرزوؤں کو کوئی پناہ نہ ملے گی ۔ اِن جھلمل جھلمل کرتے سفید رو پہلے ذرّوں پہ یہ کیسی تاریکی مسلّط ہو رہی ہے ۔ بالکل میرے مقدّر کی طرح ! ہاں بالکل اُسی طرح جیسے میرے مستقبل پہ سیاہ دبیز چادر پھیل رہی ہے . . . . . اب کبھی روشنی نہ ہوگی ، اُجیالے نہ ہوں گے ۔ میرے من میں کبھی پھول نہ کھلیں گے ۔ دِل کے گلشن میں کبھی بہار نہ آئے گی !

سُورج ڈوب چکا ہے ۔

میرے دل کی طرح !

تاریکی بڑھ رہی ہے ۔

میرے مقدّر کی طرح !

رات اُتر رہی ہے ۔

اور یہ میری آخری رات ہے ۔ کل سویرے میں یہاں سے چلی جاؤں گی ۔ اپنے دیس میں ۔ جہاں نہ چناروں کی مہک ہے اور نہ نیلی جھیلوں کی دیوی رہتی ہے ۔

میرے خاموش خیالو! میرے دل کی دھڑکنو! میرے قریب آکر بیٹھ جاؤ۔ یہ بہت نازک لمحہ ہے۔ بہت نازک گھڑی ہے۔ اپنی نرم و نازک اُنگلیاں میرے دِل پہ رکھ دو۔ کہیں یہ دھڑکنیں بند نہ ہوں۔ میرے ذہن کا دریچہ کھُل چکا ہے۔ مجھے ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔ ایک ایک راز میرے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ اور اِس سے پہلے کہ رات اُتر آئے میں تمہیں ایک کہانی سُنانا چاہتی ہوں۔ سُنو گے نا؟

ٹورسٹ سنٹر میں کچھ دیر ستانے کے بعد جب میں پھر گاڑی میں بیٹھی تو ٹھیک دائیں جانب والی سیٹ پہ ایک نئے ہم سفر کو دیکھا۔ لانبے لانبے بکھرے ہوئے بال۔ گلے میں ڈھیلی سی ٹائی۔ چہرے پہ ایک آوارہ سی اُداسی لئے وہ کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ آگے اور آگے۔ پتھریلی سڑکیں پیچھے رہ گئیں۔ اب گاڑی نے پہاڑی موڑ اپنا لئے تھے لیکن وہ دُوسرے ہم سفروں سے بے خبر دُور پہاڑوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا کہ اچانک سامنے لگے شیشے میں ہماری نظریں ٹکرائیں۔ میں گھبرا سی گئی۔ اُس کی گہری موٹی آنکھوں میں مجھے ایک جھیل نظر آئی۔ ایک ایسی جھیل جس کی تہہ میں سینکڑوں کہانیاں چھُپی ہوتی ہیں۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف۔ ایک بار پھر ہماری نظریں مل گئیں۔ وہ اپنے لانبے لانبے بے ترتیب بالوں پہ اُنگلیاں پھیرنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ کچھ گنگنانے لگا۔

کچھ دیر بعد سارا آسمان بادلوں کی اوٹ میں چھُپ گیا۔ گاڑی بلندی کی طرف جا رہی تھی اور بادل پستیوں کی طرف آ رہے تھے۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔

"اِس راستے کا کوئی بھروسہ نہیں"۔

سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ایک چھوٹے قد کی عورت اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

میں نے اپنے من ہی من میں سوچا۔
"اس راستے کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میرے اللہ اگر راستہ بند ہوگیا تو میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟ تنہا ہوں۔ بھیّا سری نگر میں انتظار کر رہا ہوگا اور میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

"اگر راستہ واقعی بند ہوگیا تو کیا کسی جگہ ٹھہرنے کا انتظام ہے؟"
بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔
اُس نے میری طرف دیکھا۔
میری گھبراہٹ کو شاید سمجھ گیا۔
"میں سفر میں آسمان تلے سونے کا آدمی ہوں۔"
مجھے اُس کے جواب پر تعجب ہُوا۔
"میں اپنی بات کر رہی ہوں۔"
اُس نے فوراً جواب دیا۔ "آپ جیسے لوگوں کے لئے ریسٹ ہاؤس بھی ہوتے ہیں۔"
میں خاموش رہی۔
مجھے اُس کے ہر انداز سے نفرت ہوگئی۔
اور پھر وہی ہُوا جس کا ڈر تھا۔ بٹوت سے کوئی پندرہ میل آگے لینڈ سلائیڈ گرنے کی وجہ سے سڑک ٹوٹ چکی تھی۔ ٹریفک روک دیا گیا تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔
"سڑک تو آج ٹھیک ہو نہیں سکتی۔ اس لئے آپ لوگ ریسٹ ہاؤس یا کسی اور جگہ ٹھہرنے کا انتظام کر لیجئے۔"

ہم لوگ گاڑی سے نیچے آ گئے۔

بارش نے اب شدت اختیار کر لی۔

اور میں تنہا، اکیلی سوچ رہی تھی، کیا کروں؟ کس سے کہوں۔ پہلی بار بھیّا کے اصرار پر کشمیر دیکھنے آئی تھی کہ اِس بارش نے سارا پروگرام ہی تباہ کر دیا۔ میں اپنے خیالوں میں خاموش ڈوبی ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے ہم سفر آہستہ آہستہ کمروں میں جانے لگے۔ اچانک وہ میرے قریب آیا۔

"آپ کچھ پریشان سی معلوم ہوتی ہیں؟"

اُس نے کہا۔

"نہیں تو!" میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ نے ابھی تک کمرہ کیوں نہیں لیا۔ اور بھی گاڑیاں آ رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد یہاں کمرہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔" اُس نے اُسی لہجے میں کہا۔

"بات در اصل یہ ہے۔" میں نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ "میں پہلی بار یہاں آئی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟"

"اوہ! ایسی بات ہے!"

وہ چلا گیا۔

میں پھر سوچنے لگی۔

"میں یہاں آئی ہی کیوں تھی۔ بھیّا تو اب دو سال سے سری نگر میں ہے۔ اِن دو سالوں میں وہ برابر مجھے آنے کے لئے لکھتا رہا ہے۔ میں کبھی نہ مانی۔ اور اب

ہوائی تو بارش ۔۔۔۔۔!"

دفعتاً میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ بارش سے بھیگتا ہوا آرہا تھا۔ اور میرا مختصر سا سامان اُس کے پیچھے پیچھے ایک قُلی لا رہا تھا۔

"آیئے، آپ کے لئے میں نے کمرہ لے لیا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن میرا دل زور سے دھڑکا۔ اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔ قُلی نے میرا سامان کمرے میں رکھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ ۔۔!"

میں نے بہت مشکل سے کہا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے سُوٹ کیس سے گرم کپڑے نکالے اور باتھ رُوم میں چلی گئی۔ مُنہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے گرم کپڑے پہنے۔ اور کمرے میں لگے ہوئے قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنے اجنبی ہم سفر کے بارے میں سوچنے لگی۔

"آپ کی چائے!" پیچھے سے آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ریسٹ ہاؤس کا بیرا چائے کی ٹرے لئے کھڑا تھا۔

"چائے، کس کی چائے؟"

میں نے حیرت سے پُوچھا۔

"جی آپ کی!"

"میری چائے! لیکن تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"جی ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔" وہ گھبرا سا گیا۔ میں سمجھ گئی میرے

اجنبی ہم سفر نے چائے کے لئے کہا ہو گا۔

"ٹھیک ہے رکھ دو۔" وہ جانے لگا تو میرے ذہن میں فوراً ایک نیا خیال اُبھرا۔

"بلوائیے اُن سے کہ دو کپ چائے پر اُن کا انتظار کر رہی ہوں۔"

بیرا چلا گیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔

"میم صاحب! وہ کہتے ہیں کہ آپ پی لیجئے۔ میں چائے کا عادی نہیں۔"

ابھی ابھی میرے دل میں اُس کے خلوص کے لئے جو تھوڑی سی جگہ پیدا ہو گئی تھی، اُس پر پھر نفرت غالب آ گئی۔

"عجیب آدمی ہے۔"

رات کو اُس کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے میں کب سو گئی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو مجھے محسوس ہوا کوئی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا میرا ہم سفر دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"راستہ ٹھیک ہو گیا ہے اور ہم لوگ ابھی سری نگر جا رہے ہیں۔ آپ بھی تیار ہو جائیے۔"

وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا کوئی بات میرے ہونٹوں پہ آتے آتے رہ گئی۔

جب بس سری نگر کے لئے چل پڑی میں نے اُس سے کہا۔

"کل شام اگر آپ ....."

اُس نے میری بات کاٹ دی۔

"کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں ؟"

"میں شبنم ہوں۔ دِلّی سے آ رہی ہوں۔ سری نگر میں میرے بھیا انجینئرنگ کالج میں پڑھتے ہیں۔" میں نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"اور آپ ؟"

"مجھے شبنم کہتے ہیں۔"

"شبنم، شبنم"۔ یہ نام میں نے کہیں سنا تھا۔ اس کی تصویر میں نے کہیں دیکھی تھی۔ چند لمحوں کے لئے میں کھو گئی۔ میں اُسے پہچان گئی۔ اُس کا نام میرے لئے واقعی نیا نہ تھا۔

اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"میں سری نگر جا رہا ہوں۔"

نہ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میرے کان کیا سُن رہے تھے۔ وہ افسانہ نگار تھا۔ میں نے اُس کے افسانے پڑھے تھے۔ صرف پڑھنے کے لئے۔ اُن میں پسند اور ناپسند کی بات نہ تھی لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اُس کی افسانوی دُنیا میں ڈوب گئی تھی۔ اُس کے افسانوں کے کرداروں کی دھڑکنوں میں سما گئی تھی۔۔۔۔۔

"کیا سوچ رہی ہیں ؟" اُس نے پُوچھا۔

"میں۔۔۔۔۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کیا یہ خواب ہے کہ میں اس افسانہ نگار کے ساتھ۔۔۔۔۔"

اُس نے پھر میری بات کاٹ دی۔

"یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔"

اِس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے کشمیر کی باتیں، کشمیر کے ملکوتی حُسن کی باتیں۔ حسین مرغزاروں کی باتیں، برف پوش پہاڑوں کی باتیں، زعفران زاروں کی باتیں۔ ہم نے باتیں کیں اُن لوگوں کی جو کشمیر کے کھیتوں میں بیگن کرتے ہیں۔ ڈھلانوں پر سیاح لوگوں کے گھوڑوں کے آگے پیچھے ننگے پاؤں دوڑتے ہیں۔ اُکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہانپتے اور کانپتے ہوئے پہلگام کے حسین مرغزاروں میں گورے اور کالے لوگوں کے درمیان گھرے ہوتے "اپنے چاک پیرہن رفو کرنے والوں کی۔ اُن لوگوں کی جو دُوسروں کے لئے پھُول چُنتے ہیں اور اپنے دلوں کے مُرجھائے اور پژمردہ گُلوں کا ہار پروتے ہیں کشمیر کے اُن لوگوں کی باتیں جو جھیل وُلر کی وسیع گہرائیوں میں خاردار سنگھاڑوں کے لئے غوطے لگاتے ہیں۔

اور شبنم کہہ رہا تھا۔

"میں کشمیر جا کر ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں کشمیر کے لوگوں کی حقیقی تصویر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اِس تصویر میں رنگ بھرنا چاہتا ہوں۔ اُسے وہ حسُن دینا چاہتا ہوں، جس کی وہ حقدار ہے۔ اور . . . اور . . . "

وہ خاموش ہو گیا۔

اُس کی آنکھیں بے حد اُداس ہو گئیں۔

اُسی لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں ایک خوبصورت سا پھُول کھلنے لگا ہے اور اُس پھُول کی خوشبو سے نفرت کا جذبہ مٹتا جا رہا ہے۔ جب میں نے اُس سے اپنے بارے میں کچھ کہنے کو کہا تو اُس نے کتنی معصُومیت سے جواب دیا۔

"مَیں وہی ہوں جو میری کہانیاں ہیں!"

اتنا مختصر سا جُملہ اور اتنی بڑی بات!!

کوئی دو بجے کے قریب ہماری گاڑی سری نگر پہنچ گئی۔ بھیّا کو راستہ ٹھیک ہو جانے کا پتہ لگ چُکا تھا۔ وہ میرا منتظر تھا۔ اپنے بھائی کو آج دو سال کے بعد دیکھا تو نہ جانے کیسے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔

"آپ کا سامان اُتار لیا گیا ہے۔ ذرا دیکھ لیجئے"۔

"اُف! میں بھُول ہی گئی تھی"۔

"بہت جلد بھُول گئیں آپ"۔

"بھیّا!" میں نے فوراً بات کا رُخ پھیر دیا "بھیّا! یہ شبنم صاحب ہیں۔ کہانی کار شبنم۔ یہ میرے ہم سفر تھے اور اِنہوں نے . . ."

شبنم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ سے مل کر بہت خُوشی ہوئی"۔

"مجھے پال کہتے ہیں"۔

دونوں نے ہاتھ ملا دیئے۔

"میں آپ کا ممنون ہوں"۔

میں جب بھیّا کے ساتھ جانے لگی تو مجھے محسُوس ہُوا جیسے شبنم مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن زبان ساتھ نہ دے رہی ہو۔ اُس روز میں ساری رات نہ سو سکی۔ ساری رات کسی کے لمبے لمبے بکھرے بکھرے بال میرے چہرے پر چھائے رہے۔

اتوار کو میں پال بھیا کے ساتھ گلمرگ گئی۔

میں پاگل سی ہو گئی شبنم کلب میں بیئر پی رہا تھا۔

"آپ یہاں؟"

بے ساختہ ہم دونوں ایک ساتھ بول اُٹھے۔

پال بھیا اور وہ بیئر پینے لگے میں گلمرگ کی خوبصورتی میں کھو گئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا یشتی یشتی کی آواز سُن کر میں چونکی شبنم مجھے پکار رہا تھا۔

"اُٹھو اب بہت سو چکی ہو۔"

"پال بھیا کہاں ہے؟"

"ارے وہ تو کب سے گاف کھیل رہا ہے۔"

"اور آپ؟"

"میں؟"

"ہاں آپ کیا کر رہے تھے؟"

"میں . . . ."

وہ خاموش ہو گیا۔

"بتایئے نا آپ کیا کر رہے تھے؟" میں نے کُریدا

"میں . . . . میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔"

میں شرما گئی اور میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کیا دیکھ رہے تھے آپ مجھ میں؟"

وہ خاموش ہو گیا اور پھر کچھ دیر بعد اُس نے میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"نہیں جانتا کہ میں کیا دیکھ رہا تھا۔ ایک بیکراں سمندر جسے میں اپنی نگاہوں سے ناپنے کی کوشش کر رہا تھا"۔

پھر نہ جانے کیا ہُوا کیسی ہوا چلی جو میرے دل کے تاروں کو چھُو گئی۔ میں بے ساختہ شبنم کے قریب آئی اور اُس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے چُوما۔ اتنے میں پال بھیّا آ گئے۔ ہم لوگ ساتھ واپس آ گئے۔ اُس رات پال بھیّا کے کہنے پر شبنم نے ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ بے تکلفی کی درمیان جو دیوار تھی وہ ختم ہو گئی۔ پھر دونوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔

پال بھیّا اپنے کالج کے کام میں مصروف ہو گیا اور میں صبح سے شام تک شبنم کے ساتھ گھومنے لگی۔ کبھی پہلگام اور کبھی ولر لیک۔ کبھی چشمہ شاہی اور کبھی ہارون۔ مجھے وہ شام بالکل یاد ہے، اُس شام کے وہ خوبصورت لمحے، شکارے میں ڈل کی سیر، نہرو پارک کا خوبصورت تر گوشہ۔ شبنم میری آنکھوں میں ڈوب کر کہہ رہا تھا۔

"شششی! تم نہیں جانتیں شاید، جب سردیوں کے دنوں میں ڈل کی نیلگوں سطح منجمد ہو کر آئینے کی وسیع چادر کی سی شکل اختیار کر جاتی ہے تو ڈل کی گہرائیوں سے سینکڑوں چشمے اُبل کر ڈل کو بہ مانے رہتے ہیں۔ مجھے تمہاری یہ دو آنکھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے منجمد نیلگوں وسعتوں سے دو اُبلتے ہوئے چشمے ہوں، جو میرے دل کو۔۔۔۔۔۔!"

"شبنم!"

"شششی!"

دن گزرتے گئے۔

محبت جاگتی رہی۔

شبنم کے ملنے سے میری خاموش سی زندگی میں ایک طغیانی سی آگئی۔ میرے جذبات کے بند اچانک ٹوٹ گئے اور مجھے محسوس ہونے لگا جیسے یہ طغیانی مجھے لے ڈوبے گی۔

"تم شبنم سے پیار کرتی ہو، اُسے چاہتی ہو، بالکل اُسی طرح جیسے وہ تمہیں چاہتا ہے" دل سے آواز آتی۔

"پر تم اُسے نہیں اپنا سکتیں" جواب دیتا۔

"لیکن کیوں؟" دل پوچھتا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مٹی ایک ہے لیکن رنگ الگ الگ ہیں۔ پودا ایک ہے لیکن پھل الگ الگ ہیں۔ یہ ایک دوسرے میں مل نہیں سکتے۔ ایک دوسرے کی جانب جھک نہیں سکتے۔ اور تم بغاوت بھی نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ سماج اور مذہب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ یہ ہاتھ سماج اور مذہب کی دیواروں کو گرتے نہیں دیکھ سکتے۔ تمہیں واپس جانا ہوگا۔ چناروں کی جھک چھوڑ کر۔ نیلی جھیلوں کی دیوی چھوڑ کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور شبنم کو چھوڑ کر۔!"

بے ساختہ میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔

"شبنم!!"

اُسی رات میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی محبت کو زندہ رکھنے کے لئے، اپنے پیار کو امر بنانے کے لیے" میں نے واپس جانے کی بات کی۔ وہ خاموش بُت بنا میری طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی خاموشی میں بھی مَیں اُس کے دل کی بات

سمجھ گئی۔

میرا دل اُداس ہے۔

رونا چاہتا ہے شاید۔

کل سویرے میں یہاں سے واپس جا رہی ہوں۔ شبنم بھی واپس جانا چاہتا ہے۔ اُس نے ناول کے لئے میٹریل جمع کر لیا ہے۔ ممّیا کے کہنے پر وہ جموّں تک میرا ساتھ دے گا۔ میرے ممّیا کو اُس پر کتنا اعتماد ہو گیا ہے۔ میرا ممّیا کتنا اچھا ہے۔ اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد شاید ہم کبھی نہ ملیں گے۔۔۔ شاید کبھی نہیں۔ یہ یادیں ہی کافی ہیں زندہ رہنے کے لئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اب کسی کو نہیں اپناؤں گی۔ اِن یادوں کے ساتھ ساری عمر تباہ کر دوں گی"

وہی راستہ۔

وہی موسم۔

شبنم اور رشمی ایک ہی بس میں سفر کر رہے تھے۔ ایک ہی سیٹ پر بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے تھے۔ جب بس قاضی گنڈ کے قریب پہنچی تو اچانک بارش تیز ہو گئی۔ بٹوت تک کا راستہ صاف تھا لیکن پتنی ٹاپ پر راستہ خراب ہونے کی وجہ سے ٹریفک بٹوت ہی میں روک دیا گیا۔

وہی کمرہ۔

وہی لوگ۔

"شنو، تم تھوڑی دیر کے لئے باہر چلو۔ میں ذرا نہاؤں" رشمی نے کہا۔

"ہاں ہاں!" شبنم جیسے خواب سے چونک پڑا۔

"تم ذرا چائے کے لئے کہہ دو۔"

شبنم جب ذرا دیر بعد لوٹا تو رشمی چائے پر اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے رشمی کو دیکھا۔ نہانے کے بعد اُس نے فاختئی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر جُھک آئی تھی۔ سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے آنکھیں بھاری ہو گئی تھیں۔ وہ آج بے حد خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ شبنم کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اُس نے رشمی کو جس انداز سے دیکھنا چاہا وہ انداز نہ پا سکا۔ اب وہ محض ایک دوست کی حیثیت سے دیکھنا دیکھنا چاہتا تھا مگر مایوس ہوا۔

محبت کبھی مر سکتی ہے۔

دل کا جذبہ کبھی فنا ہو سکتا ہے۔

"اگر غم دل نہ ہوتا . . . . . تو؟" وہ سوچنے لگا۔

"کہاں کھو گئے؟" رشمی نے پُوچھا۔

"اوہ!" وہ ہنس دیا۔ "میں واقعی کھو گیا تھا۔ اور جب آدمی کھو جاتا ہے تو وہ اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتا ہے۔"

"چلو چلیں۔"

"کہاں؟"

"اب بارش بند ہو گئی ہے، ذرا دُور تک گھومنے چلیں گے۔ ہٹوٹ کی یہ رات میری زندگی کا بڑا سرمایہ ہے۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔

آسمان اب بھی ابر آلود تھا۔ وہ کافی دُور نکل گئے۔ سڑک کو پار کر کے کافی نیچے

چلے آتے ۔ پتھروں کو راستے سے ہٹاتے ہوئے، پستیوں کی جانب ۔
"سنو!" دفعتاً شبنم نے کہا۔ "مجھے کبھی یاد کرو گی ؟" اور اس کے ساتھ ہی
اُس کے بازو ہوا میں بلند ہو گئے۔ وہ چیزوں کا اندازہ اُسے ایک ساتھ ہو گیا۔ وہ
لڑکھڑایا اور پاؤں پھسل گیا۔ رشنی نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔
وہ دُور، بہت دُور ڈھلانوں پر پھسلتا چلا گیا۔
رشنی کے مُنہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی ۔
جب وہ شبنم کے قریب آئی تو اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی ۔ پیشانی پر زخم تھا
خُون بہہ رہا تھا۔ بازوؤں پر خراشیں آگئی تھیں اور وہ بے ہوش پڑا تھا۔ روتے
روتے اُس نے اپنی ساڑھی کا پلّو پھاڑا اور پیشانی کا خُون صاف کرنے لگی۔
اچانک بادل زور سے گرجے ۔
اُس کا دل دھڑکنے لگا ۔
بارش ہونے لگی۔ وہ گھبرا گئی۔ بارش کی چھینٹوں سے شبنم ہوش میں آ گیا ۔
اور گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔
"میں ٹھیک ہوں"
وہ ہلکی آواز میں بولا۔
بارش شدت سے برسنے لگی۔ وہ رشنی کے سہارے کھڑا ہوا۔ اُس کے سارے
جسم سے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے ۔ اُس کا سارا جسم سردی سے کانپنے لگا۔
بہت کمزور آواز میں وہ کپکپاتے ہوئے بولا۔
"مجھے سردی لگ رہی ہے"

ششی بہت مشکل سے اُسے کمرے تک لے آئی۔ چوکیدار سے لکڑیاں لیں اور آتش دان میں آگ جلا دی۔ شبنم بستر پر لیٹ گیا۔ ششی کرسی پر بیٹھ کر اُس کا سر دبانے لگی۔ اُس کا سر دباتے دباتے سو گئی۔ رات کے کوئی دو بجے اچانک شبنم کی آواز سُن کر اُس کی آنکھ کھُل گئی۔

وہ کراہ رہا تھا۔

وہ تڑپ اُٹھی۔

"مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے"۔

وہ آہستہ سے بولا۔

ششی نے آتش دان کی طرف دیکھا۔ آگ آہستہ آہستہ سُلگ رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ بارش زور زور سے ہو رہی تھی۔ چوکیدار کا کوئی پتہ نہ تھا۔ رات کے پُر اسرار اندھیرے میں بادلوں کی گرج میں وہ لرز اُٹھی۔ دُور کسی کمرے کی کھڑکی کے کواڑ دیوار سے ٹکرا کر اِس وحشت میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔ وہ پریشانی کے عالم میں کمرے میں آئی۔ لکڑیاں اب جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ وہ رونے لگی۔

"تم کہاں ہو؟" شبنم کی آواز آئی۔ اُس کے دانت بج رہے تھے۔ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر موت جیسی زردی تھی۔ ششی پریشانی سے دیکھتی رہی، روتی رہی، سوچتی رہی۔ اگر شبنم . . . . ؟!

وہ چیخ اُٹھی "نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں مر سکتا"۔

"تم پھر اُسے کیسے بچا سکتی ہو؟" دماغ نے سوال کیا۔

"ہاں ہاں میں کیسے بچا سکتی ہوں ؟ میں کیسے بچا سکتی ہوں ؟ ؟" دفعتاً رات کے اندھیرے میں روشنی کی ایک مبہم سی کرن نظر آئی۔

"نہیں نہیں یہ ممکن نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ سماج ... مٹّی ... رنگ .... پودے .... ملیے ہاتھ، یہ سب کچھ فراڈ ہیں۔ فریب ہیں۔ میں شبنم سے پیار کرتی ہوں۔ میں اُسے بچاؤں گی، میں اُسے اپناؤں گی، وہ نہیں مر سکتا۔ وہ میرا ہے ... وہ..."

شستی نے کمرے کی لائٹ بند کر دی۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے دماغ کے کواڑ بند کر لئے اور اپنی زندگی جینے کے لئے آخری چھلانگ لگا دی۔

زندگی یا موت۔!

صبح جب شبنم بیدار ہوا تو چونک پڑا۔ رات جو کچھ ہوا تھا اُس کا ایک مبہم سا خیال اُس کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ اُسے صرف اتنا یاد تھا کہ رات بھر اُس کا سر بھاری رہا اور کسی کی نازک نازک اُنگلیاں ...... اُس نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ اُس کے سینے پر سر رکھ کر رشستی گہری نیند سوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے نرم بالوں سے کھیلنے لگا۔

میرا پیار۔

میرا مستقبل ... میری زندگی۔!

بٹوٹ کی آخری رات ؟ یہ راتیں بھی حسین سویرے بن سکتی ہیں۔ میں آج تک سوچ رہی ہوں۔ نہ جانے کب تک سوچتی رہوں گی۔ لیکن زندگی کی آخری رات تو نہیں، زندگی کی آخری رات کا دُوسرا نام موت ہے۔ اور موت میرا نام نہیں، میرا نام، میری محبت تو شبنم ہے جو رات کی دین ہے۔ لیکن رات نہیں۔ بٹوٹ کی آخری رات میں کبھی نہ بھول سکوں گی۔ بٹوٹ کی رات کی آخری محبت کبھی نہ بھول سکوں گی !!!

●●

دفتر سے آتی بار میں جان بوجھ کر ہنومان گلی سے گزرا۔

درزی کی دکان کے سامنے میرے قدم خود بخود رک گئے۔ دکان میں ہینگروں میں درجنوں رنگ برنگے سوٹ لٹک رہے تھے مگر میں ایک ہی نظر میں اپنے کوٹ کو پہچان گیا۔ لکڑی کے ایک معمولی سے ہینگر میں لٹکا ہوا میرا ٹویڈ کا کوٹ ایسا الگ رہا تھا جیسے کسی خار دار ٹہنی پر گلاب کا ایک ہی پھول کھلا ہو۔۔۔ اس کوٹ کو دیکھ کر میرا دل اچھلنے لگا، زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری رگ رگ میں ایک انجانی سی مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں اور میں اپنے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان لئے آگے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔

کل پہلی تاریخ ہے۔ اس تاریخ کا میں نے پورے تیس دنوں سے انتظار کیا ہے۔ یہ دن میرے لئے کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے سے کچھ کم نہ تھے۔ کل مجھے

تنخواہ ملے گی، مجھے اپنے کام کا معاوضہ ملے گا۔ کل میں اپنے اس روشندان والے
پُرانے کوٹ کو خیر باد کہہ دوں گا۔ یہ پھٹا پُرانا کوٹ مُدّت سے میرا ساتھی رہا ہے۔
مُدّت سے ایک دوست کی طرح میرا ساتھ دیا ہے۔ مُدّت سے میرے جسم کو سرما کی دم
توڑنے والی سردی اور ٹھنڈ سے بچاتا آیا ہے۔ کل ــــ کل اسی ساتھی کو ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے چھوڑ دوں گا۔ کل میرا ایک نیا ساتھی آئے گا۔ میرے ایک نئے دوست
کا جنم ہوگا۔ نئے کوٹ کے ساتھ ساتھ ایک نئی کہانی وجود میں آئے گی۔ پچھلے
پُرانے کوٹ کے ساتھ ساتھ پُرانی کہانی بھی مٹ جائے گی، پُرانی یادیں بھی مٹ
جائیں گی ــــ اور پھر ــــ پھر میں ہنستے مُسکراتے اپنے دفتر کا رُخ کروں گا۔
راہ چلتے لوگ میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھیں گے۔ میرے ذوقِ انتخاب
کی داد دیں گے۔

"واہ کتنا خوبصورت کپڑا ہے" اور میری گردن فخر سے تن جائے گی۔ اب
کوئی میری طرف حقارت سے نہیں دیکھے گا۔ اب لالہ رگھومل نیا کوٹ دیکھ کر مجھ
سے پُرانا حساب چُکانے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ اُس کے منشی کی ہنسی آٹے کی
بوریوں کے نیچے دب کر رہ جائے گی اور اگر منشی جی حسبِ عادت لالہ رگھومل کی طرف
دیکھتے ہوئے ہنس بھی دے تو اب میرا کیا بگڑ جائے گا۔ جیسے نئے نئے اور خوبصورت
قیمتی کپڑے پہننے کا صرف ان لوگوں کو ہی حق ہے۔ جیسے ہم انسان نہیں پتّھر
ہیں۔ کوئی بھی آئے اور اپنے مضبوط بُوٹ کے پنجے تلے ہمیں دبائے۔

کل نیا کوٹ پہن کر میں خوبصورت نظر آؤں گا۔ دفتر جاتے کتنی ہی
لڑکیاں میری طرف دیکھتی ہی رہ جائیں گی۔ ایک دُوسرے کے ساتھ اشاروں

ہی اشاروں میں باتیں ہوں گی ۔ ہونٹوں پر خود بخود خوشی ناچ اُٹھے گی اور کوئی نوشی کسی شگفتہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ دے گی ۔

"دیکھ شنو کتنا سمارٹ لگ رہا ہے ـــ" شنو میری طرف دیکھے گی اور اس کی آنکھیں میری طرف اُٹھی کی اُٹھی رہ جائیں گی، اُن آنکھوں میں ایک التجا ہو گی، ایک تمنا ہو گی کہ میں ان دو گہری گہری آنکھوں میں کھو جاؤں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈوب جاؤں ۔ مگر میں کیوں دیکھوں ۔ کیوں ڈوب جاؤں ان گہری گہری آنکھوں میں ۔ میں کسی لڑکی کو لفٹ نہیں دوں گا ۔ آخر آج تک ان میں سے کسی لڑکی نے مجھے لفٹ دی ۔ کبھی میری طرف ایک بار بھی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا، ایک بار بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دیں، حالانکہ میں روز ہی اس سڑک سے گذرتا ہوں، روز ہی اِن لڑکیوں کو دیکھتا ہوں ۔ آج تک اِسی حسرت میں اندر ہی اندر جلتا رہا ۔ اِسی تمنا میں میرا دل اندر ہی اندر سڑتا رہا کہ اِن میں سے ایک بدصورت لڑکی ہی ایک بار صرف ایک بار میری طرف نظر بس اُٹھا کر دیکھے ـــ یہ لڑکیاں، آج کل کی یہ لڑکیاں نہ جانے کیوں خوبصورت اور رنگدار لبادوں پر دل دے بیٹھتی ہیں ۔ ان سفید اور رنگدار کپڑوں کے اندر چھپے ہوئے سیاہ کالے اور داغدار دلوں کو کوئی نہیں دیکھتا ۔ اِن میں کوئی نہیں جھانکتا ـــ نہ جانے یہ کیسی وبا پھیلی ہے، یہ کیسی رُت چلی ہے، یہ دُنیا کیوں اندھی ہو گئی ہے ـــ !

یہ ٹھیک ہے کہ میں غریب آدمی ہوں ۔ میرے کندھوں پر ایک بڑی فیملی کی ذمہ داریاں ہیں ۔ بوڑھے ماں باپ ہیں، جوان بہن ہے جو کہ ہاتھوں کو مہندی کا انتظار ہے ۔ چھوٹی بہن ہے جسے تعلیم کی ضرورت ہے ۔ اپنا مکان نہیں ۔ ایک ہفتہ وار اخبار

کے دفتر میں سب ایڈیٹر ہوں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں نے پچھلے مہینے سنٹرل سٹور والوں سے ایک دوست کی سفارش سے قسطوں پر کوٹ کے لئے کپڑا لیا ہے اور میرا یہ کوٹ ایک مہینے سے درزی کے پاس پڑا ہے اور مجھے کل کا انتظار ہے۔ کیونکہ کل پہلی تاریخ ہے نا، مجھے تنخواہ ملنی ہے اور تنخواہ ملتے ہی میں درزی سے کوٹ لوں گا۔ درزی کی اُجرت دینے کے لئے مجھے اِس مہینے گیا نہیں کرنا پڑا۔ اس بار میں نے ایک دفعہ بھی دفتر میں چائے نہیں پی، سگریٹ ترک کر دیئے۔ بجلی کا کرایہ نہیں دیا۔ یہ سب ٹھیک ہے مگر مجھے اپنے ایڈیٹر امجد صاحب کی اس بات سے بھی اتفاق نہیں کہ غریب آدمی کو آج کل کی دُنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں، اسے بلا پُوچھے خودکشی کرنی چاہیے۔ اُس روز اُس کی بات سُن کر میں خاموش رہا حالانکہ کہنا چاہتا تھا کہ اندھیری رات کے بعد چاندنی رات بھی آتی ہے، پت جھڑ کے بعد بہار بھی آتی ہے۔ یہ گھنی تاریک اندھیری راتیں ایک روز بہار کی چمکتی شفاف صبح میں تبدیل ہونگی۔ ہر رات کا خاتمہ صُبح سے ہوتا ہے۔ ہر تاریکی کا خاتمہ سویرے سے ہوتا ہے۔ ہم بھی ایک دن چاندنی کے رازدار بنیں گے۔ قوس و قزح کی رنگینی اور کہکشاں کے خاموش اُجالوں کا بھیدی بنیں گے۔ ایک دن ہمارے دامن میں بھی پھول اور موتی ہوں گے۔ ہمارے دلوں کے یہ بُجھے ہوئے دیئے بھی کبھی روشنی سے جگمگا اُٹھیں گے ــــ مگر میں کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ وہ اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ اخبار اُس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ میں اندر ہی اندر اپنے آپ کو سمجھاتا رہا، تسلی دیتا رہا۔ اُسے کچھ سمجھانا اُس کی شان میں گستاخی تھی۔ اور اگر کہنے کی جرأت کرتا بھی تو مسکراتے ہوئے مس سلمہ سے کہتا۔

"مس سلمیٰ دیکھا۔ دیپک کیسی باتیں کرنے لگا ہے"۔

اور مس سلمیٰ ـــــ جو ہمارے اخبار کی نامہ نگار ہے، بڑی معصومیت، بڑی ادا سے جواب دیتی ـــــ" امجد صاحب یہ دیپک کا قصور نہیں، ہر وہ آدمی جو احساس کمتری کا شکار ہے، ایسی ہی باتیں کرتا ہے ـــــ" امجد صاحب مس سلمہ کی اس معصومیت پر، اس ادا پر ہوٹل میں کئی نئے نئے نوٹ پھونک دیتے!

یہ امجد صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ کافی مالدار۔ یہ مال اس نے کس طرح حاصل کیا، یہ بھی ایک راز ہے۔ یہ راز میں بھی جانتا ہوں۔ مس سلمیٰ بھی جانتی ہے، اخبار کا مالک بھی جانتا ہے، دفتر کا ہر ملازم جانتا ہے۔ اخبار میں بڑی بڑی سنسنی خیز خبریں میرے قلم سے وجود میں آتی ہیں۔ سماج کے ٹھیکیداروں کے چہروں سے نقاب میں اٹھاتا ہوں۔ ان کو اصلی روپ میں پیش کرنے کی دھمکیاں میں لکھتا ہوں اور ان سے حاصل کی ہوئی رقم ایڈیٹر اور مالک کی جیبوں میں جاتی ہے، اور وہ اپنے ملنے والوں سے فخر بہ طور کہتے پھرتے ہیں ـــــ" ہم تو ملک اور قوم کی خدمت اخبار کے ذریعہ کرتے ہیں"۔ ان دونوں کو اخبار چلانے کا شوق ہے۔ مس سلمیٰ کے آنے سے امجد صاحب کا یہ شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ دونوں زیادہ تر اب مل کر ہی کام کرتے ہیں۔ کبھی دونوں فائلوں پر جھک جاتے ہیں۔ کبھی سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں اور کبھی زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں، حالانکہ امجد صاحب خوبصورت نہیں۔ چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے داغ ہیں مگر کپڑے خوبصورت اور قیمتی پہنتے ہیں، ہر دوسرے تیسرے روز سوٹ بدلتے ہیں ـــــ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میں امجد صاحب سے کافی خوبصورت ہوں۔ میرا چہرہ گلِ دوپہر کی طرح بے داغ ہے۔

مگر مس سلمیٰ نے کبھی دل کھول کر مجھ سے بات نہ کی۔ کبھی میرے ساتھ بیٹھ کر چائے نہیں پی، کبھی میرے ساتھ سینما چلنے کی رضامندی ظاہر نہ کی، اور ایک بار تو مس سلمیٰ ایڈیٹر صاحب سے میری شکایت بھی کرنے لگی تھی۔۔۔۔۔ !

اور ــــ اب کل ـــــ کل پہلی تاریخ ہے نا، مجھے تنخواہ ملے گی۔ میں نیا کوٹ لوں گا۔ نیا کوٹ پہن کر دفتر جاؤں گا۔ امجد میرے سامنے پھیکا پھیکا اور بے رنگ نظر آئے گا۔ مس سلمیٰ دیکھتے ہی میرے پاس آ کر کہہ دے گی۔

"ہیلو، دیپک ـــ کیسے ہو ـــ" میں جواب نہیں دوں گا۔ آخر کیوں دوں، وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔

وہ دوبارہ بولے گی ـــــ "ارے تم مجھ سے ناراض ہو گیا۔ آؤ باہر چلتے ہیں" یہ کہتی ہوئی مسکرا دے گی۔ بھلا میں اسے مسکراتے دیکھ کر اپنی مسکراہٹ کو کیسے روک سکوں گا۔ اور پھر جب وہ مسکراتی ہے تو لگتا ہے جیسے کلیاں چٹکتی ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ ہم دونوں مسکراتے ہوئے دفتر سے باہر آئیں گے، امجد صاحب کے کمرے کے سامنے سے گذرتے ہوئے زور زور سے قہقہہ لگا دوں گا۔ اشوکا میں چائے پیتے ہوئے مس سلمیٰ مجھ سے کہہ دے گی ـــ "دیپک! تم تو بالکل شہزادے لگتے ہو"

اور پھر ـــــ اور پھر ـــــ !

خیالات میں ڈوبا جب گھر پہنچا تو ارونی خوش خوش نظر آ رہی تھی۔ کل اس کے سکول میں کوئی ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا جس میں سکول میں پڑھنے والی تمام بچیوں کے والدین کو شرکت کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ارونی میری چھوٹی سی پیاری پیاری سی بن ہے۔ اس کا جو کچھ بھی ہو، ہاں میں ہوں۔ کہنے لگی "بھیا جب یہ

ہمارے سکول میں کچھ ہوتا ہے آپ نہیں آتے۔ ہر بار ٹال جاتے ہیں۔ کل چلنا ہوگا نہیں تو میں بھی نہیں جاؤں گی — !"

"ہاں ہاں، اردشی کل میں ضرور چلوں گا، تم میرا انتظار کرنا —" اور میں نے من ہی من میں سوچا۔ کل نیا کوٹ پہن کر اردشی کے سکول جاؤں گا۔ اُس وقت میں نے اِس پھٹے پُرانے کوٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہوگا اور اردشی کی کوئی سہیلی اُسے یہ نہ کہہ سکے گی —" اردشی تمہارے بھیّا کا کوٹ کتنا پُرانا اور پھٹا ہُوا ہے۔"

پہلی تاریخ کو تنخواہ کے چکنے چکنے نوٹ میری جیب میں آ کر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ میں جب دفتر سے نکلا تو ان پر میری گرفت اتنی سخت تھی جیسے کسی تیز رفتار گھوڑے پر کوچوان کی گرفت، جیسے ڈر ہو کہ گھوڑا بے قابو ہو کر اُس کے ہاتھوں سے بھاگ نہ جائے۔ دفتر سے نکلتے وقت میں نے مس سلمیٰ پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ امجد صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی جو اس کے قریب بیٹھا پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "آج پہلی تاریخ کی خوشی میں اشوکا میں ڈنر ہو جائے۔"

تیز تیز قدم اُٹھاتے میں درزی کی دوکان کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے دل میں ایک نئی خوشی، ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ تھا۔ جونہی درزی کی دُوکان کے نزدیک پہنچا تو خلافِ معمول وہاں لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ بھیڑ کو نظر انداز کر کے میں دوکان کے اندر گھُس گیا۔ مجھ پر سکتہ سا چھا گیا۔ دل مارے خوف کے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے پاؤں زمین کے ساتھ چمٹ کر رہ گئے اور مجھے محسوس ہُوا جیسے میرے پاؤں کے ساتھ کوئی وزنی پتھر باندھا گیا ہو۔ میرا تمام جسم سرد پڑ گیا۔ درزی کی آنکھوں میں ایک اُمڈتا ہُوا سیلاب تھا۔ وہ رو رو کر سامنے کُرسی پر بیٹھے

پولیس انسپکٹر سے کہہ رہا تھا ــــــ "انسپکٹر صاحب میرا کیا ہوگا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ میں تو لُٹ گیا۔ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہا ــــــ چوروں نے کچھ بھی نہ رکھا۔ انسپکٹر صاحب میری مدد کیجئے ــ"

مَیں نے ایک نظر دوکان کے اندر ڈالی۔ دوکان خالی خالی اور ویران ویران سی تھی۔ خالی ہینگر اپنی اپنی جگہوں پر لٹک رہے تھے۔ سوٹ غائب تھے۔ میری نگاہ اپنے ہینگر پر اٹک گئی۔ گلاب کا پھول کہیں نہ تھا۔ لکڑی کا معمولی ہینگر اپنے ساتھیوں کی طرح میری طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، "تو بڈھا کپڑا ابھی تمہاری قسمت میں پہننے کو ہے۔ دیکھتے دیکھتے میری نگاہوں کے سامنے ایک منظر پھر گیا۔ کالج جاتی ہوئی لڑکیاں۔ گہری گہری آنکھیں۔ دفتر ــ مس سلمیٰ ــــ چیچک زدہ چہرہ ــــ کوٹ کی قسط ــ چائے ــ سگریٹ ــــ بجلی کا کرایہ ــــ پھر دُوسرے ہی لمحے میں نے اپنے پرانے ساتھی، پُرانے کوٹ کی طرف دیکھا جو اب بھی مجھے شدید سردی سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

میرا دوست !

میرا ساتھی !!

اور میں بے پناہ اُداسیوں کا سوغات، پریشانیوں کا ہجوم اور ارمان بھرا اُجڑا دل لے کر بے مقصد شالیمار روڈ کی طرف چل پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ گھر میں ادھنی مجھے اپنے ساتھ سکول لے جانے کے لئے میری منتظر ہوگی ــــ !!!

● ● ــــــــــــــــــــ

جھکی جھکی سی چاندنی تھی۔

ٹھہرا ٹھہرا سا نیلا پانی تھا۔

لمبی لمبی سی سبز گھاس جھیل کی تہہ سے بلند ہو کر لپٹ لپٹ کے ایک جال سا بُن رہی تھی۔ وہ دونوں خاموش تھے کہ اچانک ایک زوردار لہر اُن کی ناؤ سے ٹکرا گئی۔ ناؤ ہچکولے کھانے لگی۔ دونوں چونک پڑے۔ سریندر نہ جانے کہاں تھا۔ کیا سوچ رہا تھا۔ اپنی دُنیا میں لوٹ آیا۔ جہاں . . . . . !

"دیکھو اُوشا، آج کی رات ہمارے ارمانوں کی رات ہے۔ جانے ایسی خوبصورت رات ہماری زندگی میں پھر کبھی آئے گی۔ میرے قریب آؤ، اور تم بھی اپنی چاندنی بکھیر دو۔ اِس سے پہلے کہ صبح کی روشنی اِس رات کی چاندنی کو نگل جائے، آؤ کہ ان لمحوں کو امر بنائیں۔ زندگی کو . . . . ."

"سریندر ۔" اُوشا نے اِس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ۔ "سریندر تم مت جاؤ۔ بھگوان کے لئے مت جاؤ۔ یہ جنگ بہت بُری چیز ہے۔ اور میرا کون ہے تمہارے بغیر۔ تم جاؤ گے تو میں کیا کروں گی ؟" (ہچکیاں)

"اُوشا میرا بھی کون ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ فرض آخر فرض ہے۔ میں جنگ میں شامل نہ ہوکر اپنے مُلک کے ساتھ دھوکا کیسے کرسکتا ہوں۔ میرے مُلک کی جیت میرے پیار کی جیت ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں فرض اور محبّت کو اپنی زندگی کی آخری سانس تک نبھاتا رہوں گا۔ بس ۔ ۔ ۔ ۔ !"

اچانک جھیل میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ دو لہریں ایک دُوسرے کے گلے ملیں۔ اور ایک بڑے چٹان سے ٹکرا گئیں۔

سریندر ۔" ہچکیوں کے ساز پہ اُوشا کی آواز اُبھری ۔ "اگر جھیل کی ان لہروں کی طرح تمہارے پیار کی لہریں بھی مجھ سے الگ ہوگئیں تو کیا یہ دُنیا مجھے جینے دیگی ؟"

"پگلی تم ایسا کیوں سوچتی ہو ۔" سریندر نے کہا ۔ "جب آدمی پر قوم اعتبار کر رہی ہے، مُلک بھروسہ کر رہا ہے، تمہیں اِس پہ اعتبار کیوں نہیں ہے ۔ میں تمہارا محبُوب ہی نہیں ایک ذمہ دار سپاہی بھی ہوں۔ زمانے کا رُخ، جھیل کی یہ لہریں میرے پیار کو ڈبو نہیں سکتیں۔ وہ دیکھو جھیل کی لہریں کس زور زور سے چٹان سے ٹکرا رہی ہیں اور ناکام ہوکر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ میرا پیار بھی اسی چٹان کی طرح مضبوط ہے، اٹل ہے اور ابد ہے ۔"

اُوشا نے نیلی گہری جھیل میں جھانکا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے، اُس کے سینے میں بھی ایک ایسی ہی نیلی گہری جھیل ٹھاٹھیں مار رہی ہو۔

"سریندر ۔۔۔ کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے" اوشا نے پوچھا۔

"اوشا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ میں تمہیں پیار ہی نہیں کرتا تمہیں پوجتا ہوں تم میرے من مندر کی دیوی ہو" سریندر نے جذباتی لہجے میں کہا اور اوشا کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"اوشا تم بہت ہی خوبصورت ہو اور میں تمہیں ہمیشہ ہی خوبصورت دیکھنا چاہتا ہوں"

اوشا نے اپنی باہیں سریندر کی گردن میں حائل کر دیں۔

"تم شمع کی مانند خوبصورت ہو۔ شعلے کی طرح لرزاں، شراب کی طرح خمار آگیں میرے اور قریب آؤ اوشا ۔۔۔"

"سریندر جنگ میں مجھے بھلانا نہیں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی"

"اوشا تمہارے پیار نے مجھے وسعت دی ہے۔ زندگی سے پیار کرنا سکھایا ہے۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں ہر وقت ہر گھڑی تمہاری یادوں سے اپنی آنکھوں کے دیئے روشن رکھوں گا۔"

"لیکن یہ گھڑیاں میرے لئے صدیاں بن جائیں گی۔ سوچتی ہوں سریندر انتظار کے یہ دن اور راتیں کیسے گذاروں گی"

"اوشا تم ڈاکٹر امام کی لیبارٹری میں دل لگا کر کام کرو۔ وہ بہت ہی بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کے ساتھ کام میں مشغول رہ کر تمہارا وقت بھی گذر جائے گا۔ اور پھر ڈاکٹر میرا سب سے اچھا دوست بھی تو ہے۔ تمہارا پورا پورا خیال رکھے گا"

جب وہ رات گئے واپس آئے تو ایک دوسرے سے بچھڑنے کا ساعت

احساس تھا۔ دونوں کے دلوں میں ایک طوفان بپا تھا ایک محشر بپا تھا۔ اُوشا کی پلکوں پہ آنسو لرز لرز کر کانپ رہے تھے۔ وہ سریندر کو دیکھتی رہی، جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہُوا۔

سریندر کے جانے کے صرف چند دنوں بعد زبردست جنگ چھڑ گئی۔ انسان ایک بار پھر مر گیا تھا۔ انسانیت ایک بار پھر گم ہو گئی تھی۔ یہ وقت اُوشا کے لئے مشکل ترین وقت تھا۔ بچپن سے اب تک وہ سماج سے لڑتی آئی تھی لیکن اپنے من سے لڑنا اِس کے لئے سب سے بڑی لڑائی تھی۔ ڈاکٹر امام کے ساتھ رہ کر اس کا وقت تو گذر جاتا مگر لیبارٹری میں ڈاکٹر کے ساتھ بات کرنا بھی مشکل ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ کسی گہری سوچ کسی گہری کھوج میں لگا رہتا۔ اُوشا کا کام صرف اتنا تھا کہ مختلف چیزیں ڈاکٹر کو PASS ON کر جاتی۔ مختلف دوائیوں کا ٹیسٹ کرتی۔ یہ سب کچھ وقت گذارنے کے لئے کافی تو تھا۔ مگر دل لگانے کے لئے دل کے سکون کے لئے نہیں۔ اِس کے دل و دماغ میں ہر لمحہ سریندر موجود تھا۔ سریندر کی یاد موجود تھی ـــ اِدھر جنگ روز بروز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور ختم ہونے کے امکانات کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ ہر دن اخباروں میں جنگ میں مارے گئے انسانوں کی ایک لمبی فہرست نکلتی تھی۔ جب اُس کی نظر اس فہرست پہ پڑ جاتی تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ یہ فہرست پڑھنے سے پہلے وہ اپنے بھگوان کو یاد کرتی ـــ اور پھر اپنے من ہی من سوچتی؛ آخر یہ جنگ کیوں ہوتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں لڑتے کیوں ہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہیں۔ زمین اور جائداد کے لئے ـــ اقتدار کے لئے ـــ محبت اور پیار کے لئے جنگ کیوں نہیں ؟ !

کام کرتے کرتے جب کبھی سریندر کی یاد شدت سے تڑپا جاتی تو بے ساختہ اس کا ہاتھ اس دیک کی طرف بڑھ جاتا جہاں کتنی ہی زہریلی بوتلیں اس کا منہ چڑا رہی ہوتیں۔ اور جنہیں دیکھتے ہی اس کے سارے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی۔ کوئی بھی بوتل اٹھا کر وہ اپنے منہ کے قریب لے جاتی لیکن دوسرے لمحے اسے احساس ہوتا خودکشی گناہ ہے۔ زندگی سے مایوس ہونا بزدلی ہے۔ اسے سریندر کی باتیں یاد آجاتیں "میں فرض اور محبت کو اپنی آخری سانس تک نبھاتا رہوں گا۔" اور وہ ایک نئے ارادے، نئے عزم کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔

ایک دن اسے سریندر کا ایک مختصر سا خط ملا۔

"میری اوشا!

میں ٹھیک ہوں۔ اس وقت چند لمحوں کی فرصت پا کر موم بتی کی مدد سے اپنے کیمپ میں بیٹھا تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ پہاڑ سی رات ہے۔ ہر طرف موت کی سی بھیانک تاریکی ہے۔ لیکن یہ رات، یہ تاریکی میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ کیونکہ میرا من، میرا ذہن میرے محبوب کی یاد سے روشن ہے۔ تم کیسی ہو۔

تمہارا اپنا سریندر

اوشا نے خط کو اپنی آنکھوں سے چوما اور اسی وقت اس کا ہاتھ کاغذ کی چکنی چکنی سطح پہ پھسلنے لگا۔

"میری زندگی —— سریندر!

تمہارے خط نے مجھے زندگی دی ہے۔ زندہ رہنے کا درس دیا ہے اور میں تمہاری یاد لے کر زندہ ہوں۔ یاد —— جو ایک تیز اور نوکیلا کانٹا ہے۔ جس کی

نبز آنکا۔ سے خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ مگر اِس یاد میں شہر بھی بھی ہے۔ ایک پُر اسرار احساسِ محبت بھی ہے۔ میرے محبوب آؤ اور دیکھو تمہاری یاد میں میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ میرے پہپوش جیسے ہونٹوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جن ہونٹوں پر کبھی گدبت ناچتے تھے، اب اُن پر گرم گرم آہیں ہیں۔ جن گالوں پر کبھی زعفرانی رنگت جھلکتی تھی اب اُن پر آنسوؤں کی لکیریں ہیں۔ آندھیاں آتی ہیں تو میرا دل لرزنے لگتا ہے۔ بجلیاں کوندتی ہیں تو آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیتی ہوں۔ چراغ بھڑک کر بجھ جاتا ہے تو راتیں طویل ہو جاتی ہیں، اور ایسے میں تمہیں چلا چلا کر پکارتی ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہوتے ہو۔ آواز کیوں نہیں دیتے۔ تمہیں میرے پُوجا کے پھولوں کی قسم۔ اب چلے بھی آؤ ——!

تمہاری اپنی اُوشا

اُس شام لیبارٹری میں کام کرتے کرتے اُوشا فیصلہ بھی نہ کر سکی کہ وہ خوش ہے یا اُداس۔ خوش وہ اِس لئے تھی کہ سریندر کا خط مل گیا تھا۔ اُداس اِس لئے تھی کہ سریندر اُس سے کافی دور تھا۔ موت کے منہ میں تھا۔ زندگی اور موت کے مرقد پر کھڑا، اپنے مُلک اور اپنی قوم کی عزت کا جھنڈا ہاتھ میں سنبھالے لڑ رہا تھا —— اُوشا سوچنے لگی۔

"کاش! سریندر اِس وقت یہاں ہوتا۔ میں اُس کی گود میں سر رکھ کر کہتی، —— میرے دیوتا، آؤ میرے بدن پہ اپنے سخت اور خوبصورت ہاتھ پھیرو۔ میرے جسم کو ٹٹولو —— مجھے اپنا بنا لو —— آؤ —— آؤ ——"

بے ساختہ اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے

اندھیرا چھا گیا۔ اس کا منہ جھلسنے لگا۔ اسے شدّت کی گرمی کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر امام کی اپنی آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔

اُوشا کا سارا چہرہ جل گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پڑی ہوئی تیزاب کی بوتل پھٹ گئی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا ۔۔!

"میں کہاں ہوں" اُس نے بے خودی کے عالم میں پوچھا۔

"اُوشا تمہیں چوٹ آئی تھی۔ مگر اب تم ٹھیک ہو۔ کوئی فکر کی بات نہیں"۔ ڈاکٹر امام نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

اُوشا کو پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا۔ جس لمحہ اس کے چہرے کی پٹّی کھولی گئی وہ اس کی زندگی کا سب سے بھیانک لمحہ تھا۔ اس کا چہرہ جل کر داغدار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر امام نے اُسے ہر ممکن تسلی دی لیکن اس تسکین سے اُس کے چہرے کی خوبصورتی واپس تو نہیں آ سکتی تھی۔ وہ ہسپتال سے گھر آئی۔ اُس نے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ اُسے زندگی سے نفرت ہوگئی۔ اپنے آپ سے نفرت ہوگئی۔ وہ صرف سوچتی رہتی۔ اُس کے ذہن کی ناؤ میں صرف ایک سوال ہچکولے کھا رہا تھا۔ کیا سریندر مجھے اس حالت میں اپنا لے گا ۔۔۔ ؟ !!

ڈاکٹر امام اُسے سمجھاتا۔

"اُوشا وہ پیار ہی کیا جو چہرے کی خوبصورتی تک محدود ہو۔ پیار تو روحوں کا ملاپ ہے۔ جسموں کا ملاپ نہیں۔ اگر سریندر تمہیں واقعی چاہتا ہوگا وہ تمہیں ہر حالت میں اپنائے گا۔

"نہیں، نہیں ڈاکٹر ۔۔۔ مَیں اُسے ملنا نہیں چاہتی۔ جب وہ جنگ سے

واپس آئے گا تو اُسے میرا پتہ ہرگز نہ بتانا — ہرگز نہیں — ؟!"

چند دنوں کے بعد سریندر کا خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"اوشا — جنگ ختم ہونے کو ہے۔ اُمید ہے کہ جلد ہی چلا آؤں گا۔ تمہاری صورت دیکھنے کو دل ترس رہا ہے — اور ہاں کون جانتا ہے کہ تم بدل گئی ہو۔ شاید تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو یا اپنانے سے گریز — کاش میں تمہارا خوبصورت چہرہ آنکھوں سے دیکھ سکتا۔

سریندر

اُوشا کو خط کیا ملا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہوگئی۔ خط کا یہ جملہ "تمہاری صورت دیکھنے کو دل ترس رہا ہے" اس کے ذہن میں بار بار گونجتا رہا۔ وہ خط کا جواب دینا چاہتی تھی۔ سریندر کو سب کچھ لکھنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ لکھ سکی۔ وہ روتی رہی۔ روتی رہی۔ اتنی روئی کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔

جنگ ختم ہوگئی۔ سریندر اپنے وطن لوٹ آیا۔ سپاہی بن کر نہیں، ایک محبوب بن کر۔ وہ ڈاکٹر امام سے ملا۔ ڈاکٹر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں کی بینائی پر یقین ہی نہیں رہا۔ سریندر اتنا بدل سکتا ہے۔ یہ اُس کے لئے حیران کُن بات تھی! لیکن وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سنبھالنے کا عادی تھا۔ اس لئے سنبھل گیا وہ دیر تک اُوشا کی باتیں کرتے رہے۔ جنگ کی باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر امام نے کہا۔

"میں خود تمہیں اُوشا کے پاس لے چلوں گا۔"

"ڈاکٹر آخر وہ کام پہ کیوں نہیں آتی"؟ سریندر نے پُوچھا۔

ڈاکٹر نے جلدی بات بنائی اور کہا۔

"اُس کا وہ بُوڑھا چاچا بیمار تھا نا، اِس لئے وہ آج کل اُس کے ہاں رہتی ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر — میں — میں —!"

"بس ذرا سا اور انتظار —" ڈاکٹر امام نے کہا۔

وہ کار میں اُوشا سے ملنے چلنے گئے۔

"نمستے ڈاکٹر۔" اُوشا نے ڈاکٹر امام کو دیکھتے ہی کہا۔

"اُوشا اگر اِس وقت تمہارا سریندر آئے تو تُم کیا کرو گی؟!"

ڈاکٹر نے بات اتنی جلدی بنائی کہ اُوشا کا دِل دھک سے رہ گیا۔

"ہاں اُوشا بتاؤ تو سہی۔"

اُوشا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ڈاکٹر وہ نہیں آئے گا۔ میں نے اُسے سب کچھ لکھنے کی کوشش تو کی تھی مگر کچھ بھی نہ لکھ سکی۔ ڈاکٹر مجھے یاد ہے ایک دن اُس نے کہا تھا۔ اُوشا میں تمہیں ہمیشہ خوبصورت دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سمجھتا ہو گا میں اب بھی وہی خوبصورت اُوشا ہوں۔ ڈاکٹر وہ آئے گا تو کیا میں اُسے اپنی صورت دکھا سکوں گی — نہیں، نہیں —"

"لیکن اُوشا —"

"نہیں ڈاکٹر وہ نہیں آئے گا — کبھی نہیں آئے گا۔"

اُوشا رونے لگی۔

"لیکن فرض کرو اگر وہ آگیا ہو تو ــ؟!"

"ڈاکٹر ــ" اوشا چیخ اٹھی ــ "میں جانتی ہوں۔ وہ اب بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتا ہوگا۔ لیکن میں اُسے اپنی صورت دکھانا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے دل میں میری جو تصویر محفوظ ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہے۔"

"ایسا ہی ہوگا ــ" ڈاکٹر نے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے ــ؟" اوشا نے تیزی سے پوچھا۔

"ایسا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ سریندر آچکا ہے۔ وہ ۔۔۔۔!"

"لیکن ڈاکٹر ــ" اوشا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوشا میری بات سنو، وہ جنگ میں اپنی آنکھوں کی روشنی کھو چکا ہے۔ لیکن تم اُسے اپنے دل کی روشنی دے کر اب بھی زندہ رکھ سکتی ہو تم دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

"ڈاکٹر ــ"

"ہاں اوشا ــ"

"لیکن سریندر کہاں ہے ــ" اوشا ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"میں یہاں ہوں ــ" سریندر اوشا کے چاچا کے سہارے دروازے کے باہر کھڑا تھا ــ !!!

••